

پاکستان پیپلز پارٹی (سندھ) کنونشن

اشاعتِ
خاص

۳-۱۰ جنوری ۱۹۷۴ء

ANWAR
SAMI '73

ت ۵۰ پیسے
ی ڈاک سے : ایک روپیہ

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

۳-۱۰ جنوری ۱۹۷۴ء
قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

ادار یہ

ہفت روزہ
الفتح

جلد :- ۴ —— شمارہ : ۳۴

سندھ پیپلز پارٹی کنونشن

اشاعت خاص

خاص مضامین

احوال واقعی —— واقف حال ۵
مولانا کوثر نیازی کا پیغام —— ۶
سید قائم علی شاہ صدر سندھ پیپلز پارٹی کا انٹرویو
—— وھاب صدیقی ۷
پیپلز پارٹی - ایک جائزہ
—— مظہر الیس - قاضی ۱۱
یہ ارتقا کی منازل (نظم)
—— شبنم منادوی ۱۳
پیپلز پارٹی اور کارکن - فضل الٰہی ۱۵
چیئرمین پیپلز پارٹی مسٹر بھٹو کا حلفیہ بیان ۱۸

سرورق ○ انور سمیع

فون ۴۱۲۲۷۴

بے لوث کارکن

پاکستان پیپلز پارٹی (سندھ زون) کے کنونشن کے بارے میں سید قائم علی شاہ کا کہنا ہے کہ یہ اقدام پارٹی کو بنیادی سطح پر متحرک کرنے کیلئے کیا گیا ہے تاکہ کارکن حکومت کے معاملات سے الگ تھلگ نہ رہیں اور حکومت کے کاموں میں جہاں شریک ہوں وہاں اس کے غلط اقدامات کا محاسبہ بھی کر سکیں۔

جن ممالک میں پاکستان جیسی جمہوریت رائج ہے، وہاں حکمراں جماعت کارکنوں کو خال ہی خاطر میں لاتی ہے۔ اکثر و بیشتر کاروبار سیاست و حکومت چند با اختیار افراد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت نے زیادہ دن دیکھے ہی نہیں، جو تھوڑی بہت مدت ملی اس میں کسی پارٹی نے حکومت نہیں کی بلکہ شخصیات حکمران رہیں، بس دکھاوے کے لیے جماعت کا نام ہوتا تھا باقی رہے نام اللہ کا۔ کسی کو عوام کی پروا تھی اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ اُن کی ایک ہی پریشانی رہی کہ "اصل حاکم" ناراض نہ ہو جائے۔

۲۶ سال میں سے زیادہ عرصے ایوب اور یحییٰ کی فوجی آمریت کا سکّہ چلا۔ ایوب نے دھول جھونکنے کے لیے بی۔ ڈی سسٹم رائج کیا تھا جو اُس کے نام پر بدنما دھبہ ثابت ہوا۔ ایوب زوال کے نتیجے میں ملک میں ایک نئی سیاسی جماعت نے جنم لیا۔ اس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی ہے۔ یہ جماعت اب تک مرکزی کمیٹی اور نامزد کردہ صوبائی اور ضلعی عہدیداروں کے سہارے اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔ انتخابات سے قبل اس پارٹی کو عوامی محاذ پر زبردست مصروف رہنا پڑا۔ عظیم عوامی اُبھار کے نتیجے میں ایوب خان اقتدار سے محروم ہوتے تو انتخابات کا مرحلہ آگیا۔ انتخابات مکمل ہوتے

اور اس پارٹی نے مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت حاصل کی ، مگر یحییٰ خان نے نئے حالات پیدا کر دیے ۔ جب اقتدار ملا تو بھی اندرونی اور بیرونی محاذوں پر یہ پارٹی نئی آزمائشوں سے دوچار ہوئی ۔ اس صُورتحال میں پارٹی کی نئی تنظیم کا کام نہ ہوسکا ۔ ادھر اقتدار میں آنے کے بعد وہ لوگ جو اس پارٹی کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں تھے ، انھوں نے پہلے سے موجود بعض لوگوں کے ذریعے اپنے داخلے کا راستہ نکال لیا اور پارٹی پر قابض ہونے لگے ۔

پارٹی کی صف اوّل کی قیادت حکومت کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی ، نیچے معاملہ اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا ۔ پرانے کارکنوں کی بیدخلی اور اُن کے خلاف کارروائیاں ہو رہی تھیں ۔ جسے دیکھا سوشلزم کا نام لیتا ہے ، اُس پر انتہا پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا ، جس کسی نے کہا بدعنوانیاں ہو رہی ہیں اُسے پارٹی دشمن کا خطاب عطا کر دیا ۔ اس عمل کے دوران پیپلز پارٹی سینکڑوں اُن بے لوث ، جیالے اور بہادر کارکنوں سے محروم ہو گئی جو عظیم اُبھار کے دوران سربکف تھے اور جنھوں نے اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا ۔ اُن میں سے بعض بد دِل ہو کر بیٹھ گئے بعضوں نے علیحدگی اختیار کر لی ۔

کارکن کسی پارٹی کا متاعِ عزیز ہوتے ہیں ۔ پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کی پہلی اور واحد سیاسی جماعت تھی جسے ابتدائی مرحلے میں ایسے بے لوث ، بے غرض ، دیانتدار اور مخلص کارکن بھاری تعداد میں مِلے جنھوں نے اس کے لیے روزگار چھوڑا ۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور اسے قریہ قریہ گاؤں گاؤں قائم کر کے ثابت کیا کہ کارکن کی عظمت کا اندازہ لگانا ہے تو پیپلز پارٹی کی مقبولیت سے لگاؤ ۔

اقتدار میں آنے کے بعد کارکن ہی تھے جنھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومتی عہدے الگ ، پارٹی عہدے الگ ۔ انھیں حکومت سے زیادہ پارٹی عزیز تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ایک مضبوط پارٹی ہی حکومت کی کامیابی کی ضامن ہے ۔ اُن کا یہ مطالبہ دو سال گزرنے کے بعد اب عملی شکل کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہوا جب کہ "نئے لوگ" پیش پیش ہیں اور پرانے پس منظر میں جا چکے ہیں ۔ یہ اعلان خوش آئند ہے کہ "پرانے کارکنوں کی شکایات کا ازالہ کیا جائے اور انھیں اُن کا مناسب مقام ملے گا ۔"

پرانے کارکنوں کی اکثریت جناب بھٹو کی آزمودہ ٹیم ہے ، ممکن ہے کہ اُن میں سے چند گنتی کے افراد نے اقتدار سے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہو اور نئے آنے والوں کی اُس بدعنوان اکثریت سے مِل گئے ہوں جو ہر حکومت کے ساتھ رہے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے عیاری سے کام لیتے رہے ہیں ۔ ان لوگوں کی شمولیت سے جہاں پیپلز پارٹی پرانے کارکنوں سے محروم ہوئی وہاں اُسے عوامی سطح پر خاصا نقصان پہنچا ہے اور پارٹی کے لیے بدنامی کا باعث بنے ہیں ۔

پاکستان میں اب کوئی سیاسی جماعت اپنے کاغذی وجُود کو برقرار نہیں رکھ سکتی ۔ اُسے ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اُسے سائنسی بنیادوں پر تنظیمی ڈھانچہ کھڑا کرنا ہوگا ۔ عوام لُوٹ کھسوٹ سے دِلی نفرت کرتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ معروضی حالات انھیں اس کے اظہار کا موقع نہیں دیتے ۔

پیپلز پارٹی کے اس کنونشن کا مثبت نتیجہ صرف ایک ہی صورت میں نکل سکتا ہے کہ یہ جماعت اپنی صفوں سے ان لوگوں کا صفایا کر دے جو بدعنوانیوں کا مرتکب ہوئے ہیں ، یا جنھوں نے اقربا پروری اور خویش نوازی سے کام لیا ہے یا اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ابتدائی طور پر بنیادی یونٹوں سے رپورٹ طلب کی جائے کہ وہ پارٹی کی تنظیم کے بارے میں کیا چاہتے ہیں اور پارٹی کے اندر بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے کیا ذرائع کارگر ہوسکتے ہیں ۔

کارکنوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ صاحبِ اختیار افراد کے بارے میں اپنی واضح اور صاف صاف رپورٹ مرتب کریں اور یہ رپورٹ بنیادی یونٹوں میں منظوری کے بعد اعلیٰ سطح پر بحث میں لائی جائے ۔ ان حالات میں کارکنوں کو عملی طور پر اس امر کی ضمانت دی جائے کہ اُن کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں ہوگی ۔ سیاسی کارکن تنخواہ یا معاوضے سے نہیں بنتے ، بلکہ مقصد کی لگن اور انتھک محنت سیاسی کارکن کو جنم دیتی ہے ، یہ کارکن بے لوث ہوتا ہے ، بے غرض ہوتا ہے ، بیباک ہوتا ہے ، نڈر ہوتا ہے اور اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کر دیتا ہے ۔ وہ طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے اُس کا ہاتھ بڑی سے بڑی کرسی تک پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو محاسبے کیلئے پیش کر دیتی ہے ۔ یہی اس کا سرمایہ ہے اور بس ■■

احوالِ واقعی

واقفِ حال

پاکستان سے امریکہ کی اجارہ داری ختم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے

۳۰ دسمبر کو وزیرِاعظم بھٹو نے پیپری میں پاکستان کے پہلے فولاد کے کارخانے "کراچی اسٹیل مل" کا سنگِ بنیاد رکھا، یہ کارخانہ سوویت یونین کی مدد سے قائم کیا جائے گا۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۷۴ء کے وسط میں شروع ہوگا۔ اور یہ کارخانہ ۱۹۸۰ء تک پوری طرح کام شروع کر دے گا۔ اس کی تعمیر پر ۹ ارب روپے کی لاگت آئے گی۔ کارخانے کی پیداواری گنجائش ۱۱ لاکھ ٹن سالانہ ہوگی۔ جو توسیع کے بعد ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ کر دی جائے گی۔ اس کارخانہ میں ۵۰ ہزار افراد کام کریں گے۔

فولاد کے کارخانے کا قیام پاکستان کو خودکفیل اور اس کے دفاع کو مضبوط بنانے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعتیں کسی بھی ملک کی صنعتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جدید دنیا میں کوئی بھی ملک لوہے اور فولاد کی صنعت کے بغیر نہ تو خودکفیل ہو سکتا ہے اور نہ صنعتی ترقی کی راہ پہ گامزن ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قوم سامراجی اور نوآبادیاتی غلامی سے نجات حاصل کرتی ہے۔ تو وہ ایک قومی ائیرلائن اور قومی فولاد کی صنعت کے قیام کو اوّلیت دیتی ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ پاکستان کے سابق حکمرانوں اور منصوبہ بندی کمیشن نے اس منصوبے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اسکی وجہ سامراج نواز پالیسی تھی۔ ہمارے حکمران سمجھتے تھے، کہ امریکی سامراج کو پاکستان کی صنعتی ترقی اور معاشرہ کی فلاح و بہبود سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ منصوبہ بندی کمیشن کے لئے واشنگٹن سے "ماہرین" درآمد کئے گئے۔ ان "ماہرین" نے اپنے ملک کے مفادات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اشیائے صرف اور اشیائے تعیش کی صنعتوں کو لگانے کا مشورہ دیا، اور فولاد اور بھاری صنعتوں کے بارے میں کہا گیا کہ پاکستان ایک نیم ترقی پذیر ملک ہے۔ نہ تو اس کے پاس بھاری صنعتوں کے لئے سرمایہ ہے۔ اور نہ تربیت یافتہ فنی ماہرین ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی صنعت اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو سکے اور وہ ہمیشہ چچا سام کے در پر جبیں بوسی کرتا رہے۔ پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کے اربابِ اقتدار نے امریکی "ماہرین" کے مشورے پر امنّا و صدقنا عمل کیا اور اشیائے صرف کی صنعتیں لگا کر "صنعتی ترقی" کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ منصوبہ بندی کمیشن کے بعض محبِ وطن افسروں نے امریکی "ماہرین" کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اپنے اختلافی نوٹ میں کیپٹل گڈس انڈسٹری کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ اور اس مؤقف کی تائید میں سوویت یونین اور بھارت کی مثالیں دیں، لیکن ان افسروں کی تجاویز پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ بعض پر "کمیونسٹ" اور "سوشلسٹ" ہونے کا لیبل لگا کر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

فولاد کے کارخانے کی تعمیر صنعتی انقلاب کی جانب ایک بڑا اقدام

یہ خوش آئند بات ہے کہ موجودہ حکومت اس بنیادی صنعت کے قیام کی طرف پوری توجہ دے رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں سوویت یونین کا تعاون اور مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ غیرملکی سرمایہ اپنے ساتھ سیاسی اثرات بھی لے کر آتا ہے۔ ماسکو کا سرمایہ بھی اُسی طرح کریملن کے سیاسی اثرات لے کر آئے گا جس طرح سے واشنگٹن کا سرمایہ وائٹ ہاؤس کی سیاسی بالادستی لے کر آیا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اعلانِ تاشقند کے بعد ماسکو نے پاکستان میں فولاد کا کارخانہ لگانے کیلئے امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تاکہ پاکستان اس کے زیرِاثر رہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا، اس لئے سوویت یونین کی، ناراضگیاں بڑھ گئیں۔ اس سلسلے میں معلوم ہوا تھا کہ جب فولاد کے کارخانے کے لئے پاکستان روس سے گفت و شنید کر رہا تھا۔ تو ان ہی مذاکرات کے دوران روسی وزیرِاعظم کوسیجن نے ایک ذمہ دار پاکستانی افسر سے کہا۔ "اسٹیل مل لگانے سے پہلے پاکستان کی حکومت یہ تو سوچ لے کہ اس کا ملک ایک رہتا ہے یا نہیں"۔ اس بات سے ماسکو کے عزائم واضح تھے۔ جو اگست ۱۹۷۱ء میں روس بھارت فوجی معاہدے کی صورت میں سامنے آئے۔

پاکستان میں سوویت یونین کی سرمایہ کاری نہ ہونے کے باوجود اُس کے دباؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلے جب پاکستانی دفترِ خارجہ کے سیکرٹری سلطان محمد خان نے ماسکو کا دورہ کیا۔ تو کوسیجن نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں حکم دیا تھا کہ "مغربی محاذ پہ فائر ہرگز نہ کھولیں اگر ایسا کیا گیا تو خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔"

اب تو اسٹیل مل کے لئے روسی سرمایہ آ رہا ہے۔ لہٰذا پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اس کے سیاسی اثرات کو روکنے کے لئے مؤثر اقدامات کرے۔ ہمارے خیال میں وزیرِاعظم بھٹو کو بھی اس بات کا احساس ہے۔ اور انہوں نے اسٹیل مل کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ "دوسرے ممالک کی امداد سے فولاد کے، اور کارخانے بھی لگائے جائیں گے"۔ یہ اقدام روس کے اثرات روکنے میں مؤثر ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ پاکستان پر سے امریکہ کی اجارہ داری ٹوٹ رہی ہے۔ روس کی امداد سے فولاد کے کارخانے کا قیام اور فرانس کے اشتراک سے اسلحہ ساز فیکٹریاں قائم کرنے کا منصوبہ اس بات کا ثبوت ہیں۔



مولانا کوثر نیازی

وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات کا پیغام



مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ ہفت روزہ الفتح سندھ پیپلز پارٹی کے کنونشن پر ایک اشاعت خاص شائع کر رہا ہے۔

ہفت روزہ الفتح اور پیپلز پارٹی کا ایک دوسرے سے انتہائی قریبی تعلق رہا ہے۔ خاص طور پر عوامی تحریک کے زمانے میں ہفت روزہ الفتح نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی طور پر بڑی حمایت کی۔ مجھے آج بھی اس کا احساس ہے اور مجھے ہفت روزہ الفتح کا وہ چھوٹا سا دفتر بھی یاد ہے جہاں میں نے چند لمحے گذارے تھے۔

اب پاکستان پیپلز پارٹی گذشتہ دو سال سے اقتدار کی آزمائش سے گذر رہی ہے اس نے اپنے منشور اور اپنے اصولوں کو کس حد تک عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہ فیصلہ تو عوام اور قارئین الفتح کو کرنا ہے۔ لیکن اس مطالعہ و محاسبہ کے وقت وہ حالات پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی ہے اور اس نے کتنے کٹھن اور مشکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے پاکستان کے وقار کو بحال کیا اور اندرونی اور بیرونی طور پر پاکستان کو مستحکم کیا ہے۔

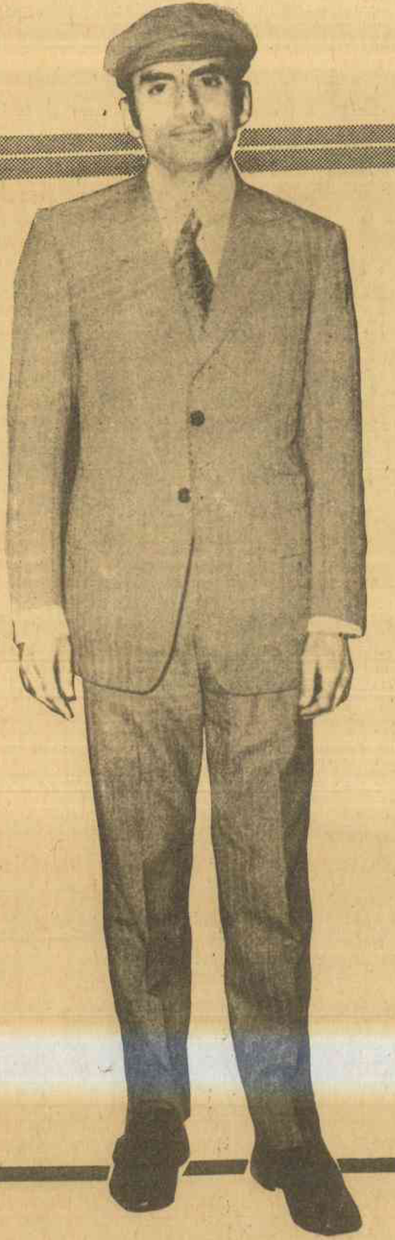
اب اقتدار کے دو برس گذارنے اور زیادہ خطرناک حالات سے گذرنے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی اپنی تنظیم کی طرف توجہ دے رہی ہے پارٹی کے کارکن شروع سے ہی پیپلز پارٹی کی تنظیم نو کے لئے بیتاب رہے ہیں میں خود اس بیتابی میں ان کے ساتھ ہوں۔ میرے نزدیک بھی اس کام کی تبدیلی کے لئے پارٹی کی حقیقی اور موثر تنظیم انتہائی ضروری ہے اور موثر و حقیقی تنظیم اس وقت قائم رہ سکتی ہے جب اس کے دُر بست پر ان مخلص کارکنوں کا تصرف ہو جنہوں نے اپنے خون سے پارٹی کا چراغ روشن کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس کنونشن سے سندھ میں پارٹی کے کارکن عزم نو سے تنظیم کے کام میں مشغول ہو جائیں گے اور اس طرح وہ اپنے منشور کو عملی جامہ پہنا کر عوام سے کئے گئے پارٹی کے وعدوں کو شرمندۂ ایفا بنا کر دم لیں گے۔



سید قائم علی شاہ
صدر سندھ پیپلز پارٹی
سے
وہاب صدیقی
کی خصوصی ملاقات
پارٹی کو حکومت پر ترجیح دی جائیگی
کارکنوں کی تربیت کیلئے ایجوکیشن سنٹر قائم ہوگیا ہے

پاکستان پیپلز پارٹی کا ڈھانچہ تبدیل کر دیا جائے گا



پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کے صدر سید قائم علی شاہ غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ تقریباً دو سال تک سینیئر صوبائی وزیر رہنے کے باوجود ان کا دامن تمام آلائشوں سے پاک اور ریکارڈ بے داغ رہا۔ اُن کے بارے میں کوئی بھی اَن کہی کہانی سُننے میں نہیں آئی۔ حزبِ اختلاف کے نزدیک یہ سنجیدہ، منجھے ہوئے اور اعتدال پسند سیاستدان ہیں۔ عوام میں ایمان دار اور جمہوریت پسند عوامی سیاستدان اور پیپلز پارٹی میں مخلص سیاسی کارکن کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اسی مقبولیت کے پیشِ نظر انہیں پیپلز پارٹی سندھ کا صدر بنایا گیا ہے۔

"پیپلز پارٹی کا یہ کنونشن پارٹی کی تاریخ کا ایک اہم کنونشن ہے کیونکہ صوبائی سطح پر ہونے والا یہ پہلا کنونشن ہے۔ پنجاب پیپلز پارٹی کا کنونشن ۱۵ جنوری ۷۴ء

بدعنوان افراد نکال دیئے جائیں گے!!

کو ہو رہا ہے۔ سندھ کنونشن میں صوبے کے مختلف اضلاع سے تقریباً ۱۵۰۰ مندوبین شریک ہو رہے ہیں۔ کنونشن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مندوبین کی اکثریت کارکنوں پر مشتمل ہے اور پرانے کارکنوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے"۔ یہ بات شاہ صاحب نے ۲۶ دسمبر کو الفتح کے لیے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہی۔

کنونشن کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے شاہ صاحب نے کہا: کنونشن کا بنیادی مقصد پارٹی کو محرک کرنا اور اس کی تنظیم کو مؤثر بنانا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی مختلف پالیسیوں اور اقدامات کی بھی وضاحت کی جائے گی۔ کیونکہ پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بعض مخلص اور سرگرم کارکن لاعلمی کی وجہ سے مایوس ہو گئے اور یہ محسوس کرنے لگے کہ پارٹی اپنے منشور اور اپنے سوشلسٹ اقتصادی پروگرام سے انحراف کر رہی ہے۔ یہ شبہات اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ پارٹی کی قیادت حکومت کے مسائل میں اتنی مصروف ہو گئی کہ وہ پارٹی پر کوئی توجہ نہ دے سکی اور نہ کارکنوں سے حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کر سکی۔ چنانچہ کارکنوں میں یہ احساس پایا جاتا تھا کہ پارٹی کا کنونشن بلایا جائے جس میں حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کی جائے اور کارکنوں کا مؤقف سُنا جائے۔ یہ کنونشن کارکنوں کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے میں بڑی مدد دے گا۔"

سید قائم علی شاہ نے بتایا کہ پارٹی کی حکومت نے گزشتہ دو سال میں قومی اور صوبائی سطح پر جو اصلاحات کی ہیں اور جو کارنامے انجام دیے ہیں اُن کی تفصیلات کارکنوں کو بتائی جائیں گی اور نتائج سے آگاہ کیا جائیگا اس کے علاوہ حزبِ اختلاف کے کردار، راہِ عمل اور مؤقف سے مندوبین کو آگاہ کیا جائے گا۔ ملکی اور صوبائی سیاست اور صورتحال پر بحث و مباحثہ ہوں گے۔ کارکن اور رہنما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اس باہمی گفت و شنید اور تبادلۂ خیال کے بعد بہتر راہِ عمل اور طریقۂ کار اُبھر کر سامنے آئے گا۔ پارٹی کے کارکنوں اور تنظیمی مسائل پر بھی غور کیا جائے گا اور حکومت اور پارٹی کے دائرہ کار کا تعین کیا جائے گا۔"

صدر سندھ پیپلز پارٹی نے کہا "کنونشن یا اس قسم کے اجتماع سے نہ صرف کارکنوں کے سیاسی شعور اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مختلف اضلاع سے مندوبین آتے ہیں، وہ آپس میں اپنے علاقوں کے مسائل پر گفت و شنید اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں، اپنے تجربات بتاتے ہیں اور اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور طریق کار کا جائزہ لیتے ہیں، کچھ سیکھتے ہیں اور کچھ سکھاتے ہیں۔"

اس سوال کے جواب میں کہ حکومت پر پارٹی کا مکمل کنٹرول ہونا چاہیے یا نہیں؟ سید قائم علی شاہ نے کہا: "حکومت پر پارٹی کا مکمل کنٹرول صرف سوشلسٹ ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوری نظامِ حکومت ہے۔ پارلیمانی نظام ہے، حزبِ اختلاف موجود ہے، کئی سیاسی پارٹیاں ہیں، ایسے حالات میں پارٹی کا حکومت پر مکمل کنٹرول نہیں ہو سکتا، لیکن میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ پارٹی کے نکتۂ نظر کو حکومت کے مؤقف پر ترجیح دی جائے اور پارٹی کو بالادستی حاصل ہو، چنانچہ ایک کونسل بنانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جو حکومت کو صلاح و مشورہ دیگی

شاہ صاحب نے بتایا کہ حکومت پر پارٹی کا مؤثر کنٹرول اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کارکن سیاست اور انتظامی امُور سے پوری طرح باخبر ہوں اور ان حالات سے پوری طرح نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے لیے سیاسی تربیت بہت ضروری ہے۔ چنانچہ

سوشلسٹ اقتصادی نظام کے نفاذ سے ملک کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے !

پارٹی کے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لاہور میں پارٹی کا ایجوکیشنل سنٹر قائم کیا گیا ہے جہاں کارکنوں کو تربیت دی جائے گی۔" شاہ صاحب نے کہا: "سوشلسٹ ممالک میں کسی فرد سے اُس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے پرانا اور برطانوی نوآبادکاروں کا بنایا ہوا نوکر شاہی کا ڈھانچہ توڑ دیا۔ گو یہ تجربہ ہمارے لیے نیا ہے لیکن اس میں ہمیں کامیابی ہو رہی ہے۔ پیپلز کمیٹیاں بنائی جائیں گی اور پارٹی کے باصلاحیت کارکنوں کو اس میں لیا جائے گا۔ یہ ادارے ملک اور قوم کے لیے سودمند ثابت ہوں گے۔

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ صوبہ سندھ میں پارٹی کی تنظیم کا کام اس سطح پر نہیں ہوا جس سطح پر ہونا چاہیئے تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ پارٹی کو اقتدار اُس وقت ملا جب ملک کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ملک شدید بحران میں مبتلا تھا۔ چنانچہ پارٹی کی صف اوّل کی قیادت اس بحران سے نمٹنے میں مصروف ہو گئی اور پارٹی کی تنظیم پر توجہ نہیں دی جا سکی۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے حال ہی میں ایک کمیٹی بنائی ہے جس کو پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ بنانے کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ اس کمیٹی کے چیئرمین خورشید حسن میر ہیں اور اس کمیٹی کے دو اجلاس ہو چکے ہیں فیصلہ کیا گیا ہے کہ پارٹی کی نچلی سطح سے لے کر اوپر تک انتخابات ہوں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے فوراً بعد پارٹی کے الیکشن ہوں گے۔ پارٹی کا نیا تنظیمی ڈھانچہ بنانے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹی کو زیادہ متحرک اور منظم کیا جا سکے اور جلد سے جلد پارٹی کے منشور خصوصاً اس کے سوشلسٹ اقتصادی پروگرام کو نافذ کیا جائے۔ اس کے نفاذ سے ملک کے کافی مسائل حل ہو جائیں گے۔"

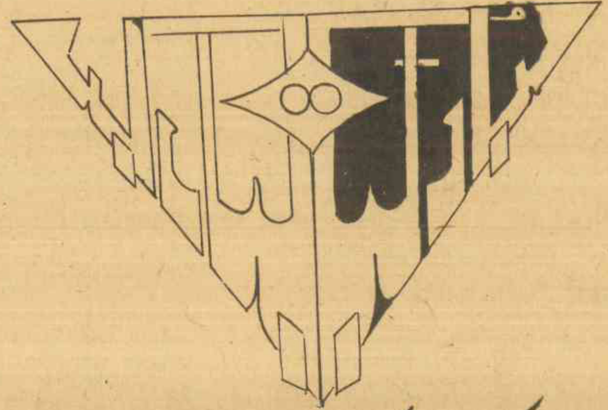
صدر سندھ پیپلز پارٹی نے تسلیم کیا کہ پارٹی میں کچھ بد دیانت اور بدعنوان عناصر گھس گئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا: "ایسے عوام دشمن اور بد دیانت عناصر کو پارٹی سے نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ آرگنائزنگ کمیٹی کے ذریعے بعض جگہ عہدے تبدیل کیے گئے ہیں۔ ایک اسکریننگ کمیٹی بنائی گئی ہے۔ اس کی ابتدائی رپورٹ پر چند افراد کو پارٹی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ابھی مکمل رپورٹ نہیں مل سکی ہے کیونکہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اسکریننگ کمیٹی ہر جگہ جا کر خود جائزہ لے گی، دستاویزی ثبوت حاصل کرے گی اور شہادتیں ریکارڈ کرے گی مکمل ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس کے علاوہ کنونشن میں یہ بات بھی زیر بحث آئے گی اور مندوبین اپنے علاقے کے بدعنوان عناصر کی رپورٹ دیں گے۔"

شاہ صاحب نے کہا: "تنظیم کو مضبوط بنایا جائے گا اور سوشلزم کے حامی کارکنوں کو آگے بڑھایا جائے گا، بدعنوان عناصر سے کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی"۔

اس سوال کے جواب میں کہ یہ احساس پایا جاتا ہے کہ کارکنوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ یہ "تاثر بے بنیاد اور سراسر غلط ہے"۔ کارکنوں کو کسی بھی موقع پر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر کچھ کارکن یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے ذاتی کام نہ کرنے کا مطلب اُن کو نظر انداز کرنا ہے تو یہ دلیل غلط ہے۔ مخلص کارکنوں کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہ ہو۔ ہماری حکومت کسی فرد یا کارکن کو معاشرہ پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ خود غرض اور گندی ذہنیت رکھنے والے افراد کو پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔"

شاہ صاحب گفتگو کے دوران ایماندار، مخلص اور باصلاحیت کارکنوں کی اہمیت اور ضرورت پر زور دے رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاہ صاحب بذاتِ خود بنیادی طور پر ایک سیاسی کارکن ہیں۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت محسوس کرنے لگی ہے کہ اُس کے مخلص اور ایماندار کارکن بددل اور مایوس ہو کر پارٹی سے علیحدگی یا گوشہ گمنامی اختیار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے پارٹی عوام سے دور ہوتی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کو جتنے باصلاحیت اور مخلص کارکن ملے اُتنے پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت کو نہیں مل سکے۔ یہ کارکن پیپلز پارٹی میں اس لئے آئے تھے کہ وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ چاہتے تھے۔ سامراجی فوجی اور اقتصادی معاہدوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن برسرِ اقتدار آنے کے بعد پارٹی کی قیادت نے کارکنوں کو نظر انداز کر دیا۔ اگر سندھ کے اس کنونشن میں پارٹی کی قیادت نے ماضی کے رویّہ کو ترک نہ کیا تو اُس کے مخلص کارکن بالکل مایوس ہو جائیں گے اور خدشہ ہے کہ ایماندار کارکنوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیپلز پارٹی، کنونشن لیگ نہ بن جائے۔





عوامی حکومت کو اس کے عہد کے دو زریں سال مبارک ہوں

پیپلز پارٹی

نے اپنے ورکروں کی بنیادی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے جس دو روزہ کنونشن کا انعقاد کیا ہے ہم اس پر بھی دلی تہنیت پیش کرتے ہیں۔

ہم ایک عرصے سے بے گھر افراد کی آبادکاری کیلئے خوشنما بستیاں بسا کر عوامی حکومت کے ایک وعدے کی ادنیٰ تکمیل کر رہے ہیں

الحیدر لمیٹڈ

بالمقابل شمع سینما ڈرگ کالونی - کراچی

نئی خارجہ پالیسی نے پاکستان کا وقار بحال کر دیا

مظہر - ایس - قاضی - پریس سیکریٹری وزیر اعلیٰ سندھ

قیامِ پاکستان خصوصاً قائد اعظم اور شہید ملت کے بعد ملک میں بتدریج مگر آہستہ آہستہ سیاسی جماعتیں اپنی موت مرنے لگیں جس کے نتیجہ میں آبادی کے تمام طبقوں میں عدم اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حکومتوں کی تیزی سے تبدیلی اور ایوان میں اراکین اسمبلی کا پارٹی تبدیل کر لینا معمولی بن کر رہ گیا تھا۔ ملک کے پاس نہ تو عوامی دستور تھا اور نہ کسی قسم کا استحکام پایا جاتا تھا۔ بیرون ملک ہمارا امیج گر گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے فوجی راج قائم کر لیا اور اس طرح رہی سہی سیاسی سرگرمیاں اور آزادی بھی مکمل طور پر سلب کر لی گئی۔ ملک ایسا کوئی رہنما پیدا کرنے میں ناکام ہو گیا جسے عوام کی حمایت حاصل ہوتی اور وہ جوان قوم کی بڑھتی ہوئی امنگوں کا ساتھ دے سکتا۔ پرانی نسل کا دلولہ اس حد تک انحطاط کا شکار ہو گیا کہ وہ نسل جس نے پاکستان بنانے کے لئے جنگ آزادی لڑی تھی اور عظیم قربانیاں دی تھیں اپنے وجود کا مقصد ہی کھو بیٹھی۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کی جارحیت کے نتیجہ میں باہمی اتحاد و یگانگت کی روح پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن پاکستان کے آمر حکمران ایوب خان نے تاشقند کانفرنس میں بھارت سے اس جذبے کا سودا کر لیا۔ اسکے نتیجے میں قوم کا حوصلہ اتنا پست ہو گیا کہ اسکا تصور بھی محال ہے۔ ان حقائق نے بالواسطہ طور پر ایسی صورتحال پیدا کر دی، جو ایک انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو اگست ۱۹۶۶ء میں وزارتِ خارجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اس علیحدگی نے قوم کو اچانک ایک لیڈر فراہم کر دیا جس کی ایک مدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی قوم نے مدتوں سے چلے آنے والے عوامی قیادت کے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے جناب ذوالفقار علی بھٹو پر نگاہ انتخاب ڈالی۔ جناب بھٹو نے نئی امیدوں کو سہارا دینے میں عجلت کی جو عوام نے ان سے وابستہ کر لی تھیں۔

مَیں نے اگست ۱۹۶۶ء میں لندن کے ڈورچسٹر ہوٹل میں جناب بھٹو سے ملاقات کی اور ان سے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی درخواست کی۔ مَیں نے جناب بھٹو سے اس سلسلے میں متعدد بار خوشگوار گفتگو کی اور اس گفتگو نے بعض اوقات علمی اور نظری موڑ بھی اختیار کیا۔

اس وقت بھی بہت سے ایسے اصحاب تھے، جنھوں نے نئی سیاسی جماعت نہ بنانے کے حق میں یہ دلیل دی کہ پاکستان میں پہلے ہی بہت سی سیاسی جماعتیں موجود ہیں اور نئی پارٹی کے وجود میں آنے سے مزید سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور بے ہنگم بھونڈی سیاست بازی جنم لے گی۔ بہرحال ہم دونوں نے یہ استدلال قائم کیا کہ پاکستان میں موجود اس وقت تک کی سیاسی پارٹیاں اپنے مشن میں بُری طرح ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے کارناموں کا ریکارڈ نہایت غریب ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہ سیاسی جماعتیں پاکستان کا بھلا نہیں کر سکیں گی کیونکہ انہیں عوامی حمایت حاصل نہیں اور وہ نظریاتی بیگانگی کا شکار ہیں۔ اور اب پاکستان کے عوام کا یہ سیاسی شعور بیدار ہو گیا ہے کہ ان سیاسی پارٹیوں نے اپنے انتخابی منشور اور وعدوں کا احترام نہیں کیا چنانچہ لوگوں نے ان پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے سوچا کہ ان وجوہات کی بنا پر لوگوں میں اعتماد کا خلا موجود ہے جسے ایک نئی طاقتور دور رس نگاہیں رکھنے والی انقلابی سوشلسٹ پارٹی ہی پاٹ سکتی ہے۔ یہ ابتدائی فکر اور بنیادی مقصد تھا۔ جس نے ایک نئی جماعت اور ایک نئی سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ نئی سیاسی جماعت اب رائے عامہ کو ہموار کرے گی اور اعتماد کے اس خلا کو پُر کر سکے گی۔ نئی جماعت کی تخلیق کے پیچھے یقیناً دوسرا قومی سبب یہ تھا کہ اس نئی نسل کو جو نئے اور جوان پاکستان میں پروان چڑھی تھی اس نے پرانی

پیپلز پارٹی

اراکین سندھ کمیٹی

صدر	سید قائم علی شاہ
نائب صدر	عبدالنبی شیخ
"	لطیف انصاری
"	کمال اظفر
جنرل سیکرٹری	عبدالفتح میمن
ڈپٹی جنرل سیکرٹری	این ڈی خان
اسسٹنٹ سیکرٹری	اعجاز خواجہ
خازن	الہٰی بخش ڈھاری

میر نذر خان گجرانی جیکب آباد، مسٹر عبداللہ بلوچ سکھر مسٹر عبدالحلیم پیرزادہ سکھر، رئیسہ نیاز قریشی سکھر، سردار پیر بخش بھٹو لاڑکانہ، مسٹر چاکر علی جونیجو لاڑکانہ، مسٹر عبدالرزاق سومرو لاڑکانہ، مسٹر ہادی بخش لاڑک خیرپور، میر علی مردان تالپور خیرپور، قاضی محمد بخش نواب شاہ، مسٹر احمد نواز اعوان نوابشاہ مسٹر منظور حسین شاہ نوابشاہ، مسٹر غلام رسول عمر سانگھڑ مسٹر علی خان جونیجو سانگھڑ، مسٹر نور محمد بگھیو حیدرآباد، مسٹر بدیع الحسن زیدی حیدرآباد، مسٹر اللہ بچایو لغاری حیدرآباد آغا خیر محمد تھرپارکر، مسٹر روشن بھچور صدر پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن، میر آفتاب شاہ میرپور خاص، مسٹر جنیو خصے ٹھٹھہ، سید منظور شاہ ٹھٹھہ، مسٹر مظفر لغاری دادو، مسٹر محمد رمضان چانڈیو دادو، مسٹر امان اللہ خٹک کراچی، مسٹر شیر محمد بلوچ کراچی، مسز نسیمہ الحموت کراچی، مسٹر غلام عباس کراچی، مسٹر ممتاز علی بھٹو،

اراکین کراچی کمیٹی

صدر	عبدالستار گبول
سینئر نائب صدر	عبداللہ بلوچ
نائب صدر	اے - الحموت
" " " "	تاج ۔ بی بی بلوچ
جنرل سیکرٹری	عبدالسلام اختر
اسسٹنٹ سیکرٹری	راجہ لیاقت حیات
سیکرٹری برائے خواتین	مسز نسیمہ سلطانہ الحموت
خازن	حاجی محمد شفیع جاموٹ
پریس سیکرٹری	حنیف سومجر

رفیق احمد عاصی، ولی محمد بلوچ، عبدالمومن خان، عبدالسمیع خان شیخ علاؤ الدین، مجتبیٰ فاروقی، صالح محمد بلوچ، حاجی عالم، احتشام ملک صدیقی، رحیم بخش آزاد، ریاض گورن، پروفیسر این ڈی خان ابوبکر، امان اللہ خان خٹک، حنیف سومجر، سید سخاوت شاہ، خان محمد گھانگھرو، احمد خان بھاشانی، محمد قاسم، لال محمد، جمعہ خان، مسز زہرا حبیب الرحمٰن، مسٹر کے اے ایچی، مرزا انور بیگ

نسل کے ہاتھوں پاکستان کو روائتی انداز میں چلانے کے معاملے کو قبول نہیں کیا تھا۔

ملک کی قیادت امنگوں اور نظریوں کے تضاد اور اس کشیدگی پر بروقت دست اندازی کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی جو دو نسلوں کے درمیان پیدا ہو چکی تھی۔ دونوں نسلوں کے درمیان سوچ کا یہ فرق روز بروز تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا ہمیں یقین تھا کہ صرف نئی جماعت ہی نوجوان نسل کو مناسب اہمیت دے سکتی ہے۔ یہ نئی پارٹی ہی نوجوان نسل کی صلاحیتوں اور ولولوں کی قدر کر سکتی تھی جو حکومت کے ڈھانچے میں تبدیلی کے خواہاں تھے، اور جس کی حکومت نے مختلف اداروں اور شعبوں میں اصلاحات نافذ کیں اور یہی نئی پارٹی پاکستان کو بچانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی اس جنریشن گیپ کو پاٹنے کا قدرتی جواب ہے۔

سیاسی پنڈت منہ چھپاتے پھر رہے ہیں

پیپلز پارٹی کے قیام کا تیسرا سبب یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنے اراکین سے سیاسی معاملات میں اختیار کلی حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی تھیں اور ان کے قیام کے پیچھے کوئی نظریہ کارفرما نہیں تھا چنانچہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان سیاسی پارٹیوں کے یہ عناصر کم و بیش وحشی حشرات الارض کی مانند تھے جن کا خمیر پراگندہ اور بنجر سیاسی زمینوں سے اٹھایا گیا تھا۔ ان پارٹیوں کی جانب سے کوئی معقول نظریہ یا فلسفہ پیش نہیں کیا گیا۔ ان پارٹیوں کے پاس ایسے موزوں منشور کا بھی فقدان تھا۔ جو ان کے مطلب اور اغراض و مقاصد کی تشریح کر سکتا۔ چنانچہ اس نظریاتی خلا کو بھی پاکستان پیپلز پارٹی ہی کو پُر کرنا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے بہ عجلت اس ضرورت کا جواب دیا اور نئے قسم کے نظریئے کو شرمندۂ تخلیق کیا ہے۔ یہ نظریہ ہماری مخصوص ضرورتوں کے لحاظ سے تراشا گیا ہے اور ہمارے نزدیک اسلامی سوشلزم کا نظریہ ان ضرورتوں کیلئے بھی حجت بن گیا ہے، پیپلز پارٹی کے قیام کا چوتھا اور سب سے بڑا سبب جس نے سیاسی پارٹی کی تخلیق میں ہماری مدد کی وہ یہ ہے کہ ہمیں انتہائی موزوں قیادت میسر آ چکی تھی، ان برسوں میں جب جناب ذوالفقار علی بھٹو شریک حکومت تھے انہوں نے اس وقت بھی خود کو انتہائی کامیاب سیاستدان ثابت کیا تھا وہ اس وقت بھی عوام میں مقبول تھے۔ اور ۱۹۶۶ء کے وسط میں پوری قوم کی نگاہیں ان کی قیادت اور رہنمائی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کی اس اشتہا اور خواہش کو شرف قبولیت بخشنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور وہ اس کی تکمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

لاہور کا کنونشن منعقدہ ۱۹۶۷ء میں انہیں متفقہ طور پر پیپلز پارٹی کا سربراہ منتخب کر لیا گیا۔ پاکستان میں نئی سیاسی جماعت کے معرض وجود میں آتے ہی قومی نقطۂ نگاہ کی تشکیل ہونے لگی۔ اور ساتھ ہی سیاسی فعالیت بھی بڑھ گئی نئی سیاسی جماعت کے ساتھ لوگوں کا بڑھتا ہوا تعلق خاطر اور روز افزوں جوش و ولولہ گویا اس امر کی واضح نشاندہی کر رہا تھا کہ پاکستان کی یہی ایک مضبوط سیاسی جماعت ہے جس پر قومی اتفاق رائے ہو سکے گا چنانچہ پارٹی نے بہت تھوڑے عرصہ میں مقبولیت عام حاصل کر لی۔ اس کے حامیوں کی تعداد اور اسکی عزت و وقار میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ پارٹی کے نظریات عوام پر واضح تر ہونے لگے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ پارٹی قیادت کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

لوگ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نہ صرف ان کے مفاد کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ایسا کرنے کی نیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ تاثر قائم ہوتے ہی لوگ پارٹی کے مخالفین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج عوام میں پارٹی کی اس مقبولیت کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ سیاسی پنڈتوں اور ڈرائنگ روم کے سیاستدانوں کے اندازوں کے قطعی برعکس مغربی پاکستان میں یہی پارٹی فتح مند ہوئی۔ اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قوم کا ہیرو اور پاکستان میں پارلیمانی طرز جمہوریت

باقی صفحہ ۳۴ پر

یہ ارتقاء کی منازل

شبنم مناروی

یہ ارتقا کی منازل عجیب ہیں پیارے
کبھی حیات کی صُورت، کبھی قضا کی طرح
کبھی ہمالہ، کبھی ایک نقشِ پا کی طرح

کبھی لُہو سے چراغاں کہ وقت دائم ہے
کبھی یہ جشنِ مُسرّت کہ ملک قائم ہے
کبھی گلاب کی صورت، کبھی صبا کی طرح

تیرے بدن پہ ابھی سازشوں کے ڈیرے ہیں
تیرے وجُود کو سرمایہ دار گھیرے ہیں
ابھی غنیم بھی، سرداریاں بھی قائم ہیں
ابھی طلب بھی، زیاں کاریاں بھی قائم ہیں

یہ ہم نے مانا ابھی وقتِ بیقراری ہے
ہر ایک چیز ابھی قیمتوں پہ بھاری ہے
ترس رہے ہیں مرے گاؤں دال روٹی کو
تمہارے شہر میں کاروں کا رقص جاری ہے

سفر تمہارا بہت ہی طویل ہے لیکن
کبھی تو رُک کے مگر اپنا احتساب کرو
جو کام کرنا ہے تم کو بہت شتاب کرو

ہر ایک رات کے پہلُو میں دل نہیں ہوتا
ہر اِک حسین کے چہرے پہ تِل نہیں ہوتا
کبھی تقاضا کہ ہر شے کو بے نقاب کرو
کبھی یہ شکوہ کہ کیوں معتدِل نہیں ہوتا؟

ہمارے ساتھ ہوا کا وجُود رہنے دو
ستارہ میں کبھی پابندِ گُل نہیں ہوتا



اسٹیمروں کے لئے

۲۴ گھنٹے

ہماری

خدمات حاضر ہیں

مندرجہ ذیل چیزوں کے لئے رابطہ قائم کیجئے

کھانے پینے کا سامان (پروژن) مچھلیاں، گوشت، ٹھنڈا گوشت، تازہ پھل، خشک میوہ جات، سبزیاں، چائے، چینی اچار، کیک پیسٹری، تازہ پنیر، تازہ مکھن اور دوسری چیزیں

● ڈبوں میں بند اشیاء	● ڈیک اور انجن اسٹورز
● مشروبات	● چپنگ اینڈ پینٹنگ
● سگریٹ	● درآمد برآمد
● سیلون اسٹورز	● آئی ڈینٹنگ

ایم اسماعیل اینڈ کمپنی

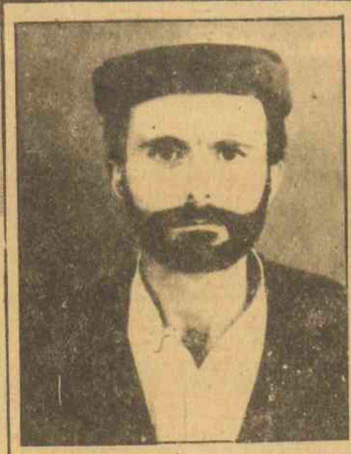
شپ چاندلرز اسٹیشن اینڈ جنرل کنٹریکٹرز

۹۸ - دلکشا چیمبر، مارسٹن روڈ۔ کراچی - پاکستان

تار KUICK SERVE فون ۷۷۱۲۹ - ۵۱۲۸۸۴ - ۶۱۵۵۹۷



علی اکبر شاد



عبدالرحمٰن بلوچ

پیپلز پارٹی اور کارکن

پیپلز پارٹی کا قیام

آمریت کے قلعہ میں پہلا شگاف

اصل دشمن پارٹی کے اندر بدعنوان عناصر ہیں

فضل الٰہی

پہلی سیاسی جماعت ہے جس نے
پیپلز پارٹی سوشلسٹ اقتصادی نظام کے تحت عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا. پاکستان کے مظلوم شہری ۲۵ سال سے استحصالی نظام کی چکی میں پس رہے تھے، سرمایہ داران کی محنت پر محلات تعمیر کر رہے تھے اور جاگیردار ہاریوں کا خون چوس کر اپنے گوداموں کو اناج کی بوریوں سے بھرنے میں مصروف تھے. تحریر وتقریر کی آزادی سلب کر لی گئی تھی. مارشل لاء کے بعد جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ کا راج تھا. سڑکوں اور گلیوں میں لٹھ بردار پولیس دندناتی پھر رہی تھی. ہر طرف سیاسی جبر اور گھٹن کی فضا مسلط تھی. ایوب شاہی اپنے ظلم کے شباب پر پہنچ کر مائل بہ زوال تھی، عوام اپنے دکھوں کے مداوا کیلئے آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے. اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا. یہ آمریت کے قلعہ میں پہلا شگاف تھا. پیپلز پارٹی کا منشور عوام کی اکثریت کی مصیبتوں اور دکھوں کا علاج تھا. مزدور، کسان، طالبعلم درمیانہ درجہ کے شہری، اور دوسرے مظلوم طبقات، پیپلز پارٹی کے پرچم تلے جمع ہو گئے. اس سے قبل ایک سیاسی جماعت کے گرد سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف مظلوم طبقات کا اتنا زبردست جم غفیر کبھی اکٹھا نہ ہوا تھا.

یہ آمریت کے قلعہ میں دوسرا بڑا شگاف تھا. حکمران ٹولہ، نوکر شاہی، سرمایہ دار اور جاگیردار بوکھلا گئے. پیپلز پارٹی کو تباہ کرنے کے لئے ریاستی مشینری حرکت میں آگئی. پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو اور دوسرے چوٹی کے رہنماؤں کو پابند سلاسل کر دیا گیا. اس کے ساتھ ہی کارکنوں پر جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے. کارخانوں سے ایسے مزدوروں کی برطرفی معمول بن گئی جو پیپلز پارٹی کی حمایت کر رہے تھے، جاگیردار ان ہاریوں پر شکاری کتے چھوڑنے لگے جنہوں نے اپنی جھونپڑیوں پر پیپلز پارٹی کے پرچم لہرا دیئے تھے. پاکستان بھر کی جیلیں عام کارکنوں سے بھر گئیں. انتہا یہ ہے کہ چودہ چودہ سال کے لڑکوں کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کیا گیا. سیاسی قیدیوں کو ایسی اذیت ناک سزائیں دی گئیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے. لیکن یہ تمام مظالم عام کارکنوں، مزدوروں، کسانوں اور طلباء کا حوصلہ پست نہ کر سکے. جتنا زیادہ تشدد ہوا کارکنوں کے شعور میں پختگی اور عزم میں بلندی پیدا ہوتی گئی. اس طرح پیپلز پارٹی عوامی طاقت کے سہارے، مغربی پاکستان کی ایک بڑی جمہوری پارٹی بن گئی. عام انتخابات کے دوران ان ہی مخلص کارکنوں نے پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے والوں کیلئے دن رات کام کیا. ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، ایک ایک فرد سے بات چیت کی گئی اور انہیں پارٹی کے پروگرام سے آگاہ کیا گیا. اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کی واحد اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے ابھری.

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یحییٰ خان سیاسی اقتدار پیپلز پارٹی کو منتقل کرنے پر مجبور ہو گیا. پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کے ایک منتخب نمائندہ کی حیثیت سے صدر پاکستان کا حلف اٹھایا ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ تنکے تنکے جوڑ کر پاکستان کی تعمیر میں مصروف ہو گئے. اب پارٹی کی حکومت کے دو سال پورے ہو گئے. اس دوران عام کارکنوں کی نظر میں پارٹی نے جہاں فاش غلطیاں کیں وہاں کچھ تعمیری کام بھی انجام دیئے. لیکن بحیثیت مجموعی پارٹی کا عوام سے رابطہ ختم ہو گیا ہے. اس میں پارٹی کی بعض موقع پرست قیادت کا ہاتھ ہے، جو یہ نہیں چاہتی کہ پارٹی کی جڑیں عوام میں باقی رہیں. اور لوگ وقتاً فوقتاً ان کا احتساب کرتے رہے. ایسے مخلص کارکنوں کو جو ان کی بدعنوانیوں کے خلاف سراپا احتجاج بنے رہے، چن چن کر نکال باہر کیا گیا. اور پرانے کنونشن لیگیوں اور بدعنوان عناصر کو انکی جگہوں پر بھر دیا گیا. اس طرح پارٹی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک مؤثر سیاسی جماعت کی حیثیت سے اپنا کردار انجام نہ دے سکی جس کی توقع تھی. پارٹی کے بارے میں عام کارکنوں کے تاثرات مندرجہ ذیل ہیں.

علی اکبر شاد، صاحب داد گوٹھ ملیر میں پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری ہیں. انہوں نے منشور سے متاثر ہو کر

خون دینے والے پارٹی سے غداری نہیں کر سکتے



——— کریم بخش خاکی

۱۹۶۸ء میں پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اُن کا خیال ہے کہ پارٹی اپنے پروگرام پر پوری اتری ہے بھٹو صاحب جن حالات میں برسرِ اقتدار آئے تھے وہ بہت خراب تھے پاک بھارت جنگ سے پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی صورتحال خراب تھی۔ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا تھا۔ ہمارے نوّے ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے۔ حکومت کو یہ سارے مسائل ورثے میں ملے تھے جو فوری حل کے طالب تھے۔ اگر ان پر توجہ نہ دی جاتی تو حالات مزید بگڑ جاتے۔ چنانچہ مسٹر بھٹو نے ان مسائل پر سب سے زیادہ توجہ دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری مقبوضہ زمین واپس مل گئی، جنگی قیدی واپس آ رہے ہیں۔ خارجہ پالیسی پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گئی ہے۔ ملک کی اقتصادی حالت جو بہت ابتر تھی اب سنورنے لگی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کا علاقہ ۲۵ سال سے پانی اور بجلی کی سہولت سے محروم تھا لیکن اب دونوں سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ اگر حکومت نے اسی طرح پارٹی کے پروگرام پر عمل کیا تو ہمارا ملک یقیناً مضبوط اور خوشحال بن جائے گا۔

انہوں نے اس بات کی شکایت کی کہ ملیر میں پیپلز پارٹی کی قیادت عوام سے رابطہ بحال رکھنے میں ناکام ہو گئی ہے۔ اس علاقہ سے عبدالحفیظ پیرزادہ قومی اسمبلی کے رکن اور ولی محمد جاموٹ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ پیرزادہ صاحب سے ہمیں شکایت نہیں ہے کیونکہ وہ مرکزی وزیر ہیں، اور ان کے پاس کام بھی زیادہ ہے، لیکن ولی محمد جاموٹ سے ہمیں بہت زیادہ شکایت ہے۔ انتخاب کے بعد وہ آج تک یہاں نہیں آئے۔ پیپلز پارٹی کے دوسرے عہدیدار بھی علاقہ کے لوگوں سے نہیں ملتے، جس کی وجہ سے پارٹی کا عوام سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مخلص کارکنوں کو آگے بڑھایا جائے عوام سے رابطہ بحال کیا جائے، پارٹی کے عہدیدار اور کارکن عوام میں جائیں اور ان کے مسائل حل کرنے میں مدد دیں۔ اگر اس پالیسی پر عمل نہیں کیا گیا تو پارٹی کو، سخت نقصان پہنچے گا — انہوں نے کہا کہ علاقہ کا وڈیرہ، اب بھی ان کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ آمدورفت میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، بعض اوقات جنازہ لے جانے کے لئے راستہ بھی نہیں دیا جاتا۔ وڈیرے اب بھی پیپلز پارٹی کے مخلص کارکنوں کیخلاف انتقامی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں حکومت اور پارٹی کی قیادت کو ایسے عوام دشمن عناصر کے خلاف ایکشن لینا چاہیے

کریم بخش خاکی، پیپلز پارٹی ریوربرج سالار گوٹھ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ علاقہ کے لوگ وڈیرہ شاہی کے ظلم سے تنگ تھے۔ اس دوران پیپلز پارٹی بنائی گئی۔ چنانچہ وہ منشور سے متاثر ہو کر پارٹی میں شامل ہو گئے۔ وہ پہلے سے ایک انجمن "اتفاق غریباں سالار گوٹھ" کے جنرل سیکرٹری تھے، جو عوام کے مسائل حل کرانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ علاقہ کے وڈیرہ نے لوگوں کو انجمن اور پیپلز پارٹی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ انتخابات میں وڈیرہ اور اس کا لڑکا جو ایوب کے زمانہ میں بی ڈی ممبر تھا، علی محمود کو انتخاب لڑانا چاہتے تھے لیکن علاقہ کے لوگوں نے انہیں ٹکا سا جواب دے کر اپنے مکانات پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہرا دیا۔ اس طرح عوام کی، زبردست حمایت سے جناب پیرزادہ اور ولی محمد جاموٹ بالترتیب قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو

موقع پرستوں نے پارٹی کا عوام سے رابطہ ختم کر دیا

گئے۔ وڈیرے نے اپنی شکست کا انتقام لینے کیلئے پارٹی کے چیئرمین خان محمد لاشاری کو اتنا پریشان کیا کہ وہ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔

انہوں نے کہا کہ ملک کے ابتر حالات میں پارٹی کی حکومت نے بڑی حد تک اپنی ذمہ داری پوری کی۔ لیکن قیادت پر قابض بعض موقع پرست عناصر کی وجہ سے پارٹی اور عوام کے درمیان رشتہ برقرار نہیں رہ سکا۔ یہ عناصر نہیں چاہتے ہیں کہ پارٹی اپنے منشور کے پروگرام یعنی سوشلزم پر عمل کرے۔ وہ اپنی جاگیریں بچانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مخلص کارکنوں کے خلاف سازشیں کیں، ان پر بے بنیاد الزامات لگائے، اور اعلیٰ قیادت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی، یہ کارکن حکومت کی راہ میں حائل ہونا چاہتے ہیں۔ بیشمار ایماندار اور محنتی کارکنوں کو جھوٹے الزامات کے تحت پارٹی سے نکلوا دیا گیا — اس عمل سے مخلص کارکن دل برداشتہ ہو کر پارٹی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جس سے پارٹی کی مقبولیت کو سخت نقصان پہنچا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم لوگوں نے پارٹی کی بنیاد اپنے خون سے رکھی ہے، اگر پارٹی کو نقصان پہنچتا ہے تو ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ علاقہ کی قیادت عوام سے رابطہ قائم کرنا نہیں چاہتی تو مجبوراً پیپلز پارٹی ایکشن کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد عوام سے مؤثر تعلق پیدا کرنا تھا۔ ہم نے یہ کام پارٹی کے مفاد میں کیا تھا، لیکن علاقائی قیادت اس بات پر ناراض ہو گئی، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عوام سے کسی قسم کا رابطہ رکھا جائے وہ پارٹی کو اپنی جیب میں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پارٹی کی اعلیٰ قیادت اور وزراء کو ہمارے بارے میں غلط اطلاعات دے کر بدگمان کیا گیا۔ حالانکہ پیپلز پارٹی ایکشن کمیٹی کے تحت بہت سے فلاحی کام انجام دیئے گئے۔ انہوں نے پارٹی کی اعلیٰ قیادت پر زور دیا کہ پرانے کارکنوں کو دوبارہ پارٹی میں شامل کیا جائے، انہیں ذمہ داریاں سونپی جائیں، مفاد پرست اور بدعنوان افراد کا محاسبہ کیا جائے اور انہیں پارٹی سے نکال دیا جائے — انہوں نے کہا کہ حکومت نے منشور کے مطابق بے شمار اصلاحات کی ہیں، جس سے آئندہ چند سالوں میں عوام کو بہت فائدہ ہو گا۔

خداداد ماما، پیپلز پارٹی ملیر کے رکن ہیں، وہ بھی پارٹی کے پروگرام سے متاثر ہو کر شامل ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں میں ابھی تک پارٹی کے پروگرام پر عمل نہیں کیا گیا۔ نہ ہی کارکنوں پر پوری طرح توجہ دی جاتی ہے۔ ملیر کی قیادت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اب علاقہ میں پارٹی پروگرام پر عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ملیر میں پارٹی کی قیادت پر غلط افراد کا قبضہ ہے۔ پارٹی کے پرانے اور مخلص کارکنوں کو بے بنیاد الزامات لگا کر الگ کر دیا گیا اور جو بچ گئے ہیں وہ وڈیرہ شاہی کے عتاب کے شکار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے قیام اور اس کی تعمیر میں ان کارکنوں نے بیش بہا قربانیاں دیں۔ طرح طرح کے مصائب


خداداد ماما

پارٹی کی حکومت نے سنگین حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا

برداشت کئے، لیکن آج وہی لوگ راندے درگاہ ہیں۔
انہوں نے کہا کہ گوٹھ میں ابھی تک پارٹی کی اصلاحات نہیں پہنچیں، یہاں پانی اور بجلی مہیا نہیں کی گئی، سڑکیں بھی نہیں ہیں۔ جس سے آمدورفت میں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وڈیرہ عوام کو پریشان کرتا ہے، اور جب اس سے کچھ کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے "جاؤ جا کر اپنے بھٹو صاحب سے کہہ دو"۔ انہوں نے کہا کہ پارٹی کی غلط قیادت کی وجہ سے تنظیم دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ملیر کا دفتر کھلتا ہی نہیں۔ اور لیڈران اس علاقہ میں نیپ کا پرچار کرتے ہیں۔ صوبائی عصبیت کو ہوا دیتے ہیں، اور طرح طرح کے پراپیگنڈے سے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے پارٹی کے چیئرمین جناب بھٹو سے اپیل کی کہ وہ پارٹی کو ایسی موقع پرست قیادت سے صاف کریں، دگرنہ پیپلز پارٹی کی حالت مسلم لیگ سے زیادہ خراب ہوگی۔

پیپلز پارٹی گھگھر ایریا کے صدر جناب عبدالرحمٰن بلوچ نے کہا کہ کراچی کے حدود چھوڑتے اور داخل ہوتے وقت پیپلز پارٹی کے پرچم سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ پرچم اس علاقہ کے غریب اور مظلوم عوام نے اپنے ہاتھوں سے پارٹی کے دفتر پر لگایا ہے، یہ پرچم اس وقت تک لہراتا رہے گا۔

جب تک پارٹی کو عوام کی حمایت حاصل رہے گی۔ وہ جناب بھٹو سے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران متاثر ہوئے تھے۔ جب انہوں نے یو این او میں زبردست تقریر کی تھی۔ انہوں نے پارٹی کے قیام میں بڑا کام کیا۔ گو وہ کراچی کی حدود میں رہتے تھے لیکن وہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے ٹھٹھہ اور میرپور ساکرو میں بھی پارٹی کو مقبول بنانے کیلئے دن رات کام کیا۔ میرپور ساکرو میں ان کے قبیلے کا سردار رہتا ہے، لیکن انہوں نے ہر قسم کے خوف سے بالاتر ہو کر پارٹی کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ سرداروں نے پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے کے جرم میں علاقہ کے غریب عوام پر بہت ظلم کیا، مگر عوام نے اپنا سر نہ جھکایا، انہوں نے ہر ظلم کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے پارٹی کی حمایت جاری رکھی لوگ اتنے باغی ہو گئے تھے کہ سردار علاقہ میں اپنی گاڑیاں بھی نہیں کھڑی کر سکتے تھے۔

اُنہوں نے کہا کہ پارٹی نے خارجہ پالیسی کے سلسلے میں عوام سے جو وعدے کئے تھے اُن پر ۹۰ فیصد عمل کیا گیا۔ دولتِ مشترکہ سے علیحدگی، امریکی اثرات سے بڑی حد تک چھٹکارہ، سیٹو سے علیحدگی، عرب ممالک سے خوشگوار اور اچھے تعلقات کی بحالی، ویت نام، کمبوڈیا، شمالی کوریا اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم کر کے منشور پر عمل کیا گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ حکومت کی موجودہ کامیاب خارجہ پالیسی پارٹی کی رُوح کے مطابق ہے۔

اُنہوں نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پارٹی میں خامیاں بھی رہی ہیں۔ پارٹی اور کارکنوں کو وزراء پر بالادستی ہونی چاہیئے تھی، لیکن پارٹی پر حکومت اور وزراء کا غلبہ حاصل ہو گیا، جس سے پارٹی کی ساکھ اور مقبولیت کو نقصان پہنچا۔ پارٹی میں موقع پرست عناصر بڑی تعداد میں گھس گئے جو اندر رہتے ہوئے پارٹی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ بن گئے ہیں، ہمارے بڑے اور بدترین دشمن وہ لوگ ہیں جو پارٹی میں گھس کر پارٹی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ حکومت نے بڑی حد تک سنگین قسم کے بحران پر قابو پا لیا ہے۔ لہٰذا اب سب سے زیادہ توجہ تنظیم پر دینی چاہیئے۔ اور پارٹی کو بے ایمان اور بدعنوان عناصر سے پاک کرنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ افسر شاہی کو بھی پارٹی میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ جس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔

پیپلز پارٹی سٹی کراچی کے پرانے اور بنیادی کارکن محمد جمیل نے کہا کہ اگر پارٹی کے عہدیدار الگ اور حکومت کے عہدیدار الگ رکھے جاتے، اور پارٹی کے دروازے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، نوکر شاہی، پرانے کنونشن لیگیوں اور ان کے ایجنٹوں پر بند رکھے جاتے تو پارٹی عوام کی بہتر خدمت انجام دیتی۔ یہی عناصر پارٹی کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، انہوں نے کہا کہ پارٹی سے عوام نے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن کارکنوں کا عوام سے گہرا رابطہ تھا انہیں بدعنوان عناصر پارٹی سے خارج کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی بھی مسئلہ پر پارٹی کی سطح سے عوام کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پارٹی کی جڑیں عوام میں بالکل ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ حکومت کے عہدیداروں کو پارٹی کا سربراہ یا عہدیدار نہ بنایا جائے، حکومت اگر کسی اسکیم پر عملدرآمد کرتی ہے تو پارٹی سے سفارشات طلب کی جائیں، اور اسکیم کو عملی جامہ پہنانے سے قبل عہدیداروں کو موقع دیا جائے کہ وہ عوام کو اسکیم کی تفصیلات سے آگاہ کر کے ان کا اعتماد حاصل کریں۔ پارٹی سے بددیانت اور بدعنوان عناصر کو

> سرمایہ داروں، جاگیرداروں
> اور نوکر شاہی پر
> پارٹی کے دروازے
> بند کر دیئے جائیں!

نکالا جائے اور پرانے مخلص کارکنوں کو دوبارہ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ پارٹی کے جمہوری انداز میں انتخابات ہوں اور اچھے کارکنوں کو ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

لیاقت آباد کے کارکن شہزاد احمد نے اپنے تاثرات دیتے ہوئے کہا کہ پارٹی نے انتہائی مشکل حالات میں اقتدار لیا، اس لئے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ دو سال کے دوران اپنے منشور کے ایک ایک لفظ پر عمل کر کے دکھا دے گی، غلط ہے۔ حکومت نے کسی حد تک پارٹی پروگرام پر عمل کیا ہے۔ آئندہ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ منشور کے دوسرے پروگراموں پر عمل درآمد کرے گی، خصوصاً چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، مہنگائی اور بدعنوانیوں کا خاتمہ کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات کے بعد مخلص کارکنوں کو بری طرح نظر انداز کیا گیا، لہٰذا پارٹی کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ان کارکنوں کو دوبارہ اعتماد میں لیا جائے۔

مغربی پاکستان ہائی کورٹ لاہور رٹ پٹیشن ۱۹۴۷ بابت ۶۸ء

بیگم نصرت بھٹو ۔ مدعی —— بنام حکومت مغربی پاکستان ۔ مدعا علیہ

پٹیشن کی تائید میں نظر بند ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان



پیپلز پارٹی
کے چیئرمین ذوالفقار علی
بھٹو کا یہ حلفیہ بیان ایک
دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں ۔
پی آر کے تحت اپنی گرفتاری کو چیلنج
ان معروضی حقائق کی نشاندھی کی جو ایوبی آمریت
زوال کی جانب لے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۱
میں ان اقتصادی اور معاشرتی عوامل پر
گئی ہے جو معاشرہ کو گھن
کی طرح چاٹ رہے
ہیں ۔
(ادارہ)

مجھے نوجوان نسل پر بے پناہ اعتماد ہے



میں ذوالفقار علی بھٹو، خلف مرحوم سر شاہنواز خان بھٹو، مسلم، بالغ، ساکن لاڑکانہ، حال نظر بند بورسٹل جیل لاہور، مغربی پاکستان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ :۔

(۱) میں مذکورہ بالا رٹ پٹیشن کے مطابق "نظر بند" ہوں جو میری اہلیہ بیگم نصرت بھٹو، مدعی، نے گورنر مغربی پاکستان کے جاری کردہ میری گرفتاری کے اس حکم کو چیلنج کرتے ہوئے دائر کی ہے جو انہوں نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے رول نمبر ۳۲ کے تحت ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو جاری کیا تھا۔

(۲) میں نے رٹ پٹیشن، مدعا علیہ کی جانب سے داخل کردہ متعلقہ تحریری بیان، نظر بندی کی تائید میں عدالتِ عالیہ کے ریکارڈ پر لائے گئے مواد اور اس عدالت عالی وقار کے سامنے ہوم سیکرٹری نے جو بیان دیا تھا اس کا مطالعہ کیا ہے۔

(۳) میں نے اپنے دستخطوں سے اس عدالت عالی وقار کی خدمت میں پٹیشن کی تائید میں مزید وجوہ پیش کی ہیں اور میں یہاں تصدیق اور اعادہ کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا مزید وجوہ کے مندرجات درست اور مبنی بر حقیقت ہیں اور انہیں اس حلفیہ بیان کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۴) نظر بندی کا مجریہ حکم قانون کے اعتبار سے غلط اور مدعا علیہ کی بدنیتی پر مبنی ہے تاکہ مجھے قانونی استحقاق کے بغیر اور غیر قانونی انداز میں نظر بند رکھا جائے۔ میں اس مؤقف کی تائید میں اس عدالت عالی وقار کی توجہ کیلئے مندرجہ ذیل حقائق اور وجوہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

(۵) میں پرزور طور پر اُن الزامات کو رد کرتا ہوں جن پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کا وہ میمورنڈم مشتمل ہے جس میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت میری نظر بندی کی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ الزامات حقائق کے اعتبار سے اتنے ہی بے بنیاد ہیں جتنے مقصد کے اعتبار سے بدنیتی پر مبنی ہیں وہ مغز سے خالی ہیں۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُنہیں قانونی لبادے میں پیش کیا جاتا، جو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی بدولت بخوبی میسر آسکتا تھا۔

میں نے ۲۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو عدالتِ عالی وقار کی خدمت میں جو تائیدی وجوہ پیش کی تھیں میں نے ان میں اُن الزامات کو رد کر دیا تھا جو نظر بندی کی اُن وجوہ میں

شامل تھے جو ...
اس موقع پر پ...
ہوں کہ یہ الزام...
اُن کا مقصد غیر...
پر طویل تقریر د...
اشارات کئے...
جدا کیا گیا ہے...
مملکت کے با...
سے بیرونی طا...
کوئی حرف آ...
کو برانگیختہ کیا...
بد نظمی پھیلائیں۔...
کو بدلنے کے...
مجھ سے بالکل غ...
کیا گیا ہے۔ حقیقت...
موقف کے دا...

عوام کے حقوق...

جاتے
...یر کی کے ساتھ
ویز

...نومبر ۱۹۶۸ء کو دی گئی تھیں۔ میں
...ور سے اس مؤقف کا اعادہ کرتا
... کا پلندہ ہیں، بدنیتی پر مبنی ہیں اور
...رانہ ہے۔ میں نے متعدد مقامات
...دوران جو زبانی بیانات دیئے اور
...یں دیدہ دانستہ سیاق و سباق سے
...مروڑا گیا ہے۔ میں نے امور
...یں کوئی راز افشانی نہیں کی کہ جس
...ر ساتھ پاکستان کے روابط پر
...ی میں نے عوام کو، خصوصاً طلباء
...ہ قانون شکنی کریں یا تشدد پر اتر کر
...ے ار پر میں یہ عرض کر دوں گا کہ حکومت
... آخری دھکے" کی اصطلاح کا استعمال
...شر انگیز سیاق و سباق میں منسوب
...ہے کہ میں نے یہ اصطلاح آئینی
...یں رہتے ہوئے استعمال کی تھی۔

یہاں تک کہ میں نے خاص طور پر اُن دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو آئین کے مطابق اس حکومت کے عہد کے باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً میں نے لاہور میں ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کے پاس صرف بارہ مہینے اور انیس دن رہ گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے سابق صوبہ سرحد میں تقریروں کے دوران دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی۔ جو انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کو تبدیل کرنے میں باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے حیدر آباد میں میر رسول بخش تالپور کی کوٹھی کے صحن میں ایک محدود اجتماع سے اڑھائی گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے اس کنونشن میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان سے صدارتی انتخاب کے لئے کوئی متفقہ امیدوار سامنے نہ آیا اور اگر مغربی پاکستان سے بھی کسی پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو میں خود انتخاب لڑوں گا۔ یہ حقیقت میری اس نیت کی بہترین ترجمان ہے کہ میں حکومت کے خلاف آئینی جدوجہد شروع کرنا چاہتا تھا۔

کوہاٹ میں بھی میں نے ایک گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا۔ نظر بندی کی وجوہ میں غلط طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ کہ میں نے اُس تقریر میں یہ کہا تھا کہ اگر حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بزور اقتدار پر قبضہ کر لوں گا۔ اپنی تقریر میں میں نے کہیں بھی اس طرح کا بے سر و پا دعویٰ نہیں کیا۔ میری سیاسی سرگرمی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ عوام کی مشترکہ جدوجہد میں شامل ہو کر اُن کے گمشدہ حقوق کی بحالی کے ذریعے پاکستان کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ اگر مجھے اقتدار کی ہوس ہوتی تو میں نے اصولوں پر سمجھوتے بازی کر لی ہوتی اور قید و بند کے مراحل سے گزرنے کے بجائے اپنی مقتدر حیثیت کو قائم رکھا ہوتا۔

مجھے اصرار ہے کہ میں نے ڈیرہ اسماعیل خاں میں جلسہ عام میں تقریر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں لپنے گرمجوش استقبال پر لوگوں کا شکریہ ادا کیا تھا، اور دفعہ ۱۴۴ فوجداری کے پیش نظر اُن سے درخواست کی تھی، کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ میں نے تقریباً ۱۵ منٹ تک مختصر تقریر کی تھی۔



میرے خاندان کی زندگی
اجیرن کر دی گئی

لاہور میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سامنے ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو میں نے تقریباً چالیس منٹ تک زبانی تقریر کی تھی۔ تقریر کا موضوع خارجہ پالیسی تھا۔ حکومت نے بھارت کو جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیشکش کی تھی۔ اُس سے مضطرب ہو کر میں نے اس پیشکش کے نقصان دہ نتائج کا تجزیہ کیا تھا۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نظر بندی کی وجوہ میں میری تقریروں کے تمام ترحوالے سیاق و سباق سے جُدا کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ انہیں بدنیتی سے توڑا مروڑا گیا ہے، ان کی غلط تفسیر کی گئی ہے اور انہیں صحیح روشنی میں پیش نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ تقریروں کی رپورٹیں جو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شکستہ خط میں لکھی گئی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ میری طویل تقریروں کے مختصر خلاصے کہلا سکتی ہیں جن میں متعدد فقرے اور الفاظ اُس سیاق و سباق میں پیش نہیں کئے گئے جن میں اُنہیں ادا کیا گیا تھا۔

میں دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ اصل وجوہ جن کی بناء پر مجھے آزادی سے محروم کیا گیا ہے، نہ تو عائد کردہ الزامات میں اُن کا ذکر ہے اور نہ اُن کے مندرجات سے اُن کا کوئی تعلق ہے۔ بلاشبہ ان وجوہ کا مقدمے سے تعلق ہے لیکن کوئی شرمناک سے شرمناک حکومت بھی انہیں عوام کے سامنے لانے کی شاید ہی جرأت کر سکتی ہے۔ مگر ان کے وجود سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ وجوہ اُس بدنیتی پر مبنی ہیں، جو میرے خلاف حکام کی دھاندلیوں میں جاری و ساری ہے اور جس سے الزامات کا تانا بانا تیار ہوا ہے

الزامات میں جو دعوے کئے گئے ہیں ان کا صرف اس صورت میں کوئی سر پیر ہو سکتا ہے کہ یہ فرض کیا جائے کہ میں نے، میری پارٹی نے یا میرے رفقاء نے حکومت کا بزور تختہ الٹنے کا کوئی منصوبہ، سازش یا پلاٹ بنا رکھا تھا۔ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے رفقا کے ساتھ ملکر اس طرح کے کسی مقصد یا نیت کے ساتھ کوئی منصوبہ سازش یا پلاٹ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ حکومت کا ساختہ ہے، اُس کے تصور کا کرشمہ ہے، اُس کی خراب و خستہ حالت کا آئینہ دار ہے۔ لپنے عہد حکمرانی کے دس سالوں کی تاریکی میں اُسے ہر بات سازش نظر آتی ہے۔

(۶) ملک میں جو عوامی مظاہرے ہو رہے ہیں وہ ایک فرسودہ نظام کے خلاف اظہار احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں اور عمومی صورتحال کے خلاف ناراضی کے عکاس ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں بلند ہونے والی آوازیں حکومت کی زیادتیوں، اُس کی بدعنوانیوں، اُس کے خود غرضانہ مقاصد، انسانی حقوق کے ضمن میں اُس کی تحقیر آمیز پالیسی اُس کے ہاتھوں اداروں کی تباہی، تشدد پیشہ نوکر شاہی

...سے انکار کیا جائے گا تو وہ کسی نجات دہندہ کو تلاش کر لیں گے

پر اس کے انحصار، عوام کی خدمت میں اس کی ناکامی، ثقافت کے بارے میں اس کی نخوت آمیز روش، عوام سے اس کی حقارت اور کنبہ پروری کے ضمن میں اس کی ہوسناکی کے خلاف لوگوں کا بے ساختہ قولِ فیصل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس حکومت سے محبت ہے یا میں اس کے اطوار پسند کرتا ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ یہ حکومت کس درجے غیر معقول ہے، بلکہ پاکستان کے لوگ اسے کس درجے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جو بھی گڑبڑ مجھ سے منسوب کی گئی ہے وہ حکومت کے اپنے اعمال ــــ میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی بدعنوانی اور ظلم و تشدد ــــ کا فطری نتیجہ ہے جن کے باعث عوام کشیدہ خاطر ہو گئے ہیں۔ بے چینی کی وہ لہر جس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے رکھا ہے، اُسی عمومی عدم اطمینان کا اظہار ہے جو اربابِ اختیار کے گوناگوں اعمال کے باوجود سطح پر آنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لوگ جبر کے عہد اور اُن بدیوں کے خلاف جنھوں نے حکومت کے طرزِ حکمرانی کے باعث ہمارے معاشرے کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ احتجاج کرنے کے لئے بر سرِ عام نکل آئے ہیں۔ ہمارے عوام دوسرے ملکوں کے عوام سے مختلف نہیں۔ ان کی برداشت کی بھی ایک حد ہے، وہ بھی کسی کا درد محسوس کرتے ہیں، اور اپنے بچوں کی مسرت کے آرزو مند ہیں۔ اُن کا افلاس ناقابلِ تصوّر ہے لیکن پھر بھی وہ بہتر مستقبل کے لئے اُمید رکھتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ انہیں مناسب سامانِ زیست سکونت اور لباس میسّر ہو۔ فاقہ کشی نے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کو اور ابتلائے کتنی ہی بایوں کے آنسوؤں کو خشک کر دیا ہے۔ یہ قانونِ خداوندی نہیں کہ ہمارے عوام تاابد مایوس و نامراد رہیں اور اُن کے بچے بھوک اور بیماری سے مرتے رہیں۔ ہمارے عوام اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بہتر زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں، انہیں خوراک اور لباس کی ضرورت ہے، روزگار اور تحفّظ کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بے ہنگم خواب نہیں بلکہ وہ توقعات ہیں جو سائنس کے اس شاندار دور نے ابھاری ہیں۔ اگر عوام کے حقوق سے انکار کیا جائے گا تو وہ کسی نجات دہندہ کو تلاش کر لیں گے اور اگر نجات دہندہ میسّر نہ آیا تو خود اپنی نجات کی راہ نکال لیں گے۔ جب عوام تبدیلی چاہیں تو کسی منصوبے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ عوام کا مزاج ہی منصوبہ ہوا کرتا ہے لیکن بد دماغ حکام جو تاریخ کی رُو سے غافل ہوتے ہیں، حکومت کے تواتر کے لئے آخری دم تک ہوسناکی سے جتن کرتے رہتے ہیں۔

(۷) اگر صورتحال وہ نہ ہوتی جو تھی تو میں خواہ کچھ بھی کہتا یا کرتا اس کا امکان نہ تھا کہ عوام کسی طرح بھی متاثر ہوتے۔ معروضی صورتحال یہ ہے کہ عوام جاگ اُٹھے ہیں اور از خود آگے بڑھ کر احتجاج کر رہے ہیں۔ کسی سازش یا پلاٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا کوئی منصوبہ ہو جس نے قوم کی اقتصادی اور سماجی بہبود کو

> **نئی نسل**
> **ان مقاصد**
> **میں کامیاب**
> **رہے گی**
> **جن میں**
> **پرانی نسل**
> **ناکام رہی**

متاثر کیا ہو۔ مثال کے طور پر شکر کی نایابی میری پارٹی کے کسی پلاٹ کے باعث پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اُس نے لوگوں کو غضب ناک کرنے کا ٹھوس نتیجہ ضرور پیدا کیا۔ سنگین اقتصادی بدنظمی اور بدعنوانی کی دوسری مثالوں کے شانہ بشانہ اس کی ذمہ داری بھی خود حکومت پر تھی۔ اقتصادی بدنظمی سیاسی بے چینی کا سب سے مؤثر عنصر ہوتا ہے۔

نوآبادیاتی آقاؤں کا بندھا ٹکا بہانہ ہے کہ جب بھی محکوم عوام اُن کے خلاف اُٹھتے ہیں تو وہ ساری گڑبڑ چند سیاسی منظاہرین کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ وہ گولی، پھانسی اور قید کا نسخہ استعمال کرتے رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے قومی بیداری کے سیلاب کے آگے بند باندھ لیں گے۔ انگریز کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اپنے دور میں وہ آزادی کے ہر مطالبے کو چند غیر ذمہ دار منظاہرین کی سازباز قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ حکومت بھی دنیا کو کچھ اسی طرح کی بات کا یقین دلانا چاہتی ہے۔

(۸) تبدیلی کا مظہر جو قانونِ فطرت ہے، معاشرے کے حالات پر منحصر ہے نہ کہ خیالی منصوبوں پر۔ موجودہ نظام بہت ہی کچا ہے۔ اگر حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ میرے ایک ہفتے کے دورے سے اُس کا سارا ڈھانچا زمین پر آ رہا ہے۔ لوگوں نے مجھے اس لئے خوش آمدید نہیں کہا کہ میں تشدد کا کوئی منصوبہ زیرِ عمل لا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ جب میں نے یہ اعلان کیا کہ رشوت ستانی انتہا کو پہنچ گئی ہے طالب علموں کو بیڑیاں پہنا دی گئی ہیں، عوام کراہ رہے ہیں اور حالات ناقابلِ برداشت ہو چکے ہیں تو میں اُن کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ مائی لارڈز! صدر صاحب کے برعکس جنھوں نے اپریل ۱۹۶۷ء میں ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ہتھیاروں کی زبان استعمال کریں گے، میں نے زبان کا ہتھیار استعمال کیا جو لوگوں تک پہنچنے اور اُنھیں اُس بہتر مستقبل کی مشترکہ تلاش کے لئے متحد کرنے کا ایک جمہوری ذریعہ ہے جو قانون کی حکمرانی کے مساواتی تصورات پر مبنی ہے۔

مسئلے کی تہ تک جانے کے لئے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھے دھاندلی سے جیل میں اس لئے نہیں ٹھونسا گیا کہ میں نے اِن خیالات کا اظہار کیا تھا بلکہ اس کی وجہ وہ اختلافات ہیں جو میرے اور حکومت کے درمیان جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے۔ اگر نقاب اٹھا دیا جائے تو یہ سوال اس خلجان کو سلجھا دے گا جو میرے حکومت سے اچانک رخصت ہونے کے ضمن میں پایا جاتا ہے اور میری گرفتاری اور نظر بندی کی وضاحت بھی کر دے گا۔ صداقت کو تعصب اور جوڑ توڑ کی گرد سے پاک کر دیا جائے تو یہ اپنی پوری آب و تاب سے میرے اس بیان کے حق میں گواہی دے گی کہ نہ تو میں نے تشدّد کا پرچار کیا اور نہ طلبا کو برانگیختہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا۔ حکومت کے تھکے ماندے چہرے سے انتشار کے آثار ہویدا ہیں۔ بہر حال یہ بیمار ہے یا شاد کام میں نے بزورِ اس کا تختہ اُلٹنے کا منصوبہ نہیں بنایا۔ اس کے برعکس حکومت نے بے دریغ طاقت کا استعمال کیا ہے۔ ہر کہیں معصوموں کے خون نے زمین کو سیراب کیا ہے، کبھی بلوچستان میں اور کبھی مشرقی پاکستان میں، کسی موقع پر پنجاب اور سندھ میں اور کبھی ہمارے شمالی علاقوں کی بستیوں میں انتخابات کے دوران حکومت کے آدمی کراچی کی گلیوں میں قیصرانی شان و شوکت سے فتح کے جلوس نکالتے رہے ہیں۔

یہ حکومت طاقت سے پیدا ہوئی اور جس استحکام کا بہت ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ اس کا انحصار بھی طاقت پر ہے۔ اس نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں طاقت کے استعمال کا یہ جواز پیش کیا کہ ملک کو انتشار سے بچایا جا رہا ہے اور میں یہ پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آج ملک کہاں کھڑا ہے؟ جبر اور

جمہوریت، تازہ ہوا کے جھونکے اور گل بہار کی خوشبو کی طرح وجود رکھتی ہے



بدعنوانی سے حکومت نے ملک کو خاتمے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ اس حکومت نے اپنے سے پہلی حکومت کا تختہ اُلٹا اور اس کا نام انقلاب رکھ کر انقلاب کے لفظ کی توہین کی ہے یہ ہر سال یومِ انقلاب بھی مناتی ہے لیکن ساتھ ہی اگر کوئی اور یہ لفظ مُنہ سے نکالے تو اُسے سزا دینے میں بھی باک محسوس نہیں کرتی۔

(۹) زیادہ دیر نہیں ہوئی، مغربی پاکستان کے گورنر نے نظامِ حکومت کی جمہوری روح کا دفاع کرتے ہوئے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا اور کہا تھا کہ جمہوریت کسی ہاتھی کا نام نہیں ہے جسے لوگوں کے سامنے رکھا جا سکے تاکہ وہ اُسے چھو کر دیکھیں۔ ہاں مائی لارڈز! جمہوریت واقعی کوئی ہاتھی نہیں لیکن پھر بھی یہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح، گلِ بہار کی خوشبو کی طرح وجود رکھتی ہے۔ یہ آزادی کا نغمہ ہے جس کا ارتعاش چھونے سے بھی زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن احساس سے زیادہ جمہوریت کا مطلب ہے بنیادی حقوق، اس کا مطلب ہے بالغ رائے دہی کا حق، ووٹ کی رازداری آزاد پریس، میل جول کی آزادی، عدلیہ کی آزادی، دستور ساز اداروں کی بالادستی، انتظامیہ پر احتساب اور دیگر متعلقہ کیفیات جو موجودہ حکومت کے نظام میں واضح طور پر غالب ہیں۔ اس حکومت کے طرزِ عمل نے مطبوعہ لفظ کو بے حرمت کر دیا ہے۔ رائے دہی کو ایسے افراد تک محدود کر دیا ہے۔ جنھیں ڈرا یا دھمکا یا بہلا یا پھسلا یا جا سکتا ہے۔ قانون کی عمارت میں من مانی کی دفعات داخل کر دیں۔ دستور سازی کو معطل کر دیا، بنیادی حقوق کو ہیجان انگیز تعطل میں اور میل جول کے حق کو دفعہ ۱۴۴ کی بھٹی میں ڈال دیا۔ کسی بھی معروضی معیار سے حکومت نے جو کھٹ راگ کھڑا کیا ہے، اُسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔

(۱۰) یہ بڑی مایوس کُن حقیقت ہے لیکن اس کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ تشدد کے بغیر تبدیلی آ ہی نہیں سکتی جو محدود ذرائع میسر ہیں ان کے پورے پورے استعمال سے اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ عوام میں تبدیلی کی ایسی بے پناہ لگن ہے کہ ملک کو تشدد کے بغیر تبدیلی کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی طور پر یہ حقیقت ظاہر کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے عوام کو موجودہ حکومت اب مزید قابلِ قبول نہیں۔ اور یہ اُن کا اعتماد کھو چکی ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ حکومت کے اپنے ذاتی مفاد میں ہے کہ وہ خوش دلی سے بروقت رخصت ہو جائے اگر نظامِ حکومت میں عوام کی مرضی کے مثبت اظہار کے لئے کوئی جگہ نہیں تو حکومت کے خلاف ایک منفی فیصلے کو سیاسی طور پر مثبت کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے عوام کی خدمت کے تحت اس صداقت کا اظہار خون خرابے کا پرچار نہیں، یہ خوشامدیوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ کڑوے حقائق سے پردہ ہٹائیں۔ میرا یہ مقام نہیں کہ میں موجودہ خستہ حالی کا عوام سے خطاب کے بغیر علاج کر سکوں۔ صرف حکومت اُس اختیار سے مسلح ہے جس کے ذریعے وہ عوامی مذاکرے کے بغیر تبدیلی لا سکتی ہے۔ اگر حکومت اپنی پالیسیوں کے خلاف مظاہرے نہیں چاہتی تو اس کا علاج خود حکومت کر سکتی ہے۔ حکومت اپنی پالیسیاں بدل سکتی ہے۔ اپنے قوانین کو جمہوری بنا سکتی ہے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کیلئے نظامِ حکومت کو آزادانہ بنا سکتی ہے۔ وہ انصاف کو بروئے کار لا کر اور انسانیت پرور سیاسی اور اقتصادی حالات اُبھار کر قناعت پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن مظاہرے ہو رہے ہیں اور لوگوں میں تلخی ہے کیونکہ یہ حکومت اس کے بالکل برعکس روش پر گامزن ہے اور اپنے جبر کو "مضبوط مرکز" کا نام دیتی ہے۔

> عوام کو منصوبے کی ضرورت نہیں ہوتی ان کا مزاج ہی منصوبہ ہوتا ہے

ہوم سیکرٹری نے ۱۱ نومبر کو گورنر مغربی پاکستان کے نام جو مبسوط نوٹ صوبائی نظم و نسق کی عمومی صورتحال کے بارے میں لکھا تھا۔ اُس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اصل باعث براہ راست طلبہ نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنھوں نے طلبا کو سیاسی مقاصد کے لئے برانگیختہ اور استعمال کیا۔ میں ہوم سیکرٹری کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے طلبہ کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ مائی لارڈز! میں بالکل صاف صاف تسلیم کرتا ہوں کہ گڑبڑ کی ذمہ داری، بلا واسطہ یا بالواسطہ طلبہ پر نہیں۔ ہمارے طلبہ اتنے ہوشمند ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکیں۔ انہیں علم کے حصول کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ مجھے نوجوان نسل پر بے پناہ اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نوخیز مردوں اور عورتوں کی یہ نسل اُن مقاصد میں کامیاب رہے گی جن میں پچھلی نسل ناکام رہی۔ انہیں خدا نے پروازِ تخیل سے نوازا ہے اور آنیوالے زمانوں کا بوجھ اٹھانے کی سکت دی ہے۔ نوجوانوں کی اس نسل کا جو دنیا بھر کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ آسانی سے استحصال نہیں کیا جا سکتا۔ جدید حالات کے بارے میں مطلق جہالت ہی کسی شخص کو یہ راہ دکھا سکتی ہے کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کرے کہ آج کا نوجوان خواہ وہ پاکستان میں ہو یا کہیں اور سیاسی استحصال کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

مائی لارڈز! میرے پاس کوئی اختیار نہیں کہ میں طلبہ کو مادی فوائد پہنچا سکوں اُن کے لئے محبت اور اعتماد کے سوا میرے پاس ان پر نچھاور کرنے کے لئے سرپرستی کے ذرائع نہیں، لیکن حکومت کے پاس ان ذرائع کی کوئی کمی

نہیں۔ تمام مادی فوائد، جن میں پروپیگنڈہ پر کنٹرول بھی شامل ہے حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور پھر بھی اُس نے طلبہ کی جمعیت کی ہمدردی گنوادی ہے۔ حکومت کے برعکس میری تو طلبہ تک پہنچ بھی نہیں۔ مجھے ان کی یونیورسٹیوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ حکومت کی پراپیگنڈہ مشینری کے پہیئے، رات دن میرے خلاف زہر پھیلانے کیلئے متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن طلبہ کی جمعیت اتنی روشن ضمیر ہے کہ حکومت اپنی ان نمایاں برتریوں کے باوجود طلبہ کو استعمال کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مائی لارڈز آج کے طلبہ ہوشیار ہیں اور انہیں گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت چونکہ طلبہ کے طبقے کو سمجھ نہیں سکی اور اس نے انہیں شک کی نظر سے دیکھنا پسند کیا ہے۔ اس لئے اُس کے کارندے یہ نتیجہ نکالنے کی ناقابلِ معافی غلطی کرتے ہیں کہ معاشرے کے یہ پھول اور آنے والے کل کے سربراہ اتنے اناڑی ہیں کہ سیاسی مقاصد کیلئے ان کا استحصال کیا جاسکتا ہے۔

ہوم سیکرٹری نے سیاسی صورت حال پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہر حال پاکستان کے طالب علموں کو سیاسی بے چینی کے لدو جانور کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اصلاح کی پُرزور لگن میں طالب علم، خواہ وہ کہیں بھی ہو، سیاسی منظاہرین کے ہاتھوں استعمال ہونے والا لدو جانور نہیں بلکہ ترقی کی وہ طاقت ہے جس نے استحصال کے خاتمے کا عزم کر رکھا ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک میں طالب علم کا اثر نمایاں ہے۔ وہ معاشرے اور حکومت کی فرسودہ روایات کے خلاف بین الاقوامی مجاہد ہے۔ یہ ہے یونیورسٹی کا وہ طالب علم جسے حکومت ایک گمراہ کھلونا سمجھتی ہے ـــ میرے ہاتھوں میں گیلی مٹی کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ مَیں نے طالب علموں کو اکسایا ہے۔ گویا طالب علم پہلے سے بیدار نہ تھے اور یونیورسٹی آرڈی ننس اور دیگر اقدامات کے ذریعے سے جبر و استبداد کا جو طاغوتی نظام ان پر مسلط کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف کھلے بندوں احتجاج نہ کر رہے تھے۔ طالب علم ہمارے معاشرے کا ایک جزو ہیں اور ایسے اجنبی نہیں جو کسی الگ تھلگ حصے میں رہتے ہوں۔ یہ فطری امر ہے۔ کہ عام بدحالی اور پاکستانی عوام من حیث المجموع جن ناانصافیوں سے دوچار ہیں اور انہیں آئے دن جس طرح ہراساں کیا جاتا ہے طلبہ بھی اُن سے متاثر ہوں۔ اُس جوش و خروش کے باعث جو نوجوانوں کا طرۂ امتیاز ہے انہوں نے نہ صرف اپنی شکایات بلکہ پاکستان بھر کے عوام کے دلوں میں پلنے والی نفرت کا اظہار کیا ہے۔

فاقہ کشی نے
ماں کی چھاتیوں
میں دودھ کو
اور ابتلا نے
باپوں کے آنسوؤں
کو خشک کر دیا ہے

مجھے اصرار ہے کہ طالب علم کو نہ تو عوام کی مصیبتوں سے اور نہ اہلِ دانش کی مایوسیوں سے علیحدہ رکھا جاسکتا ہے وہ اُس دردِ انجام معاشرے کا جزو لاینفک ہے، جو استحصال کی چکی میں پس رہا ہے۔ پاکستان کا طالب علم بارہ کروڑ عوام کی آزادیٔ رائے سے محروم خلقت کی دستور ساز اسمبلی ہے۔

(۱۲) لیکن اپنے دوسرے ہم کاروں کی طرح ہوم سیکرٹری بھی اُن حد بندیوں کے اندر کام کرتے ہیں جو صداقت سے بیر رکھتی ہیں سیکرٹری صاحب مجبور ہیں کہ تصویر کو رنگ دار شیشوں میں سے دیکھیں۔ وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لوگ ایک پُرزور اور بے ساختہ لہر کی صورت میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ حکومت سے تنگ آچکے ہیں اور یہ اُن کا غلامی کے خلاف احتجاج کا اظہار ہے۔ ہوم سیکرٹری کا تجزیہ کیونکر یہ ظاہر کرسکتا ہے کہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو ابھار پایا جاتا ہے وہ چند سیاسی تقریروں سے پیدا نہیں ہوا بلکہ چینی اور دوائیوں جیسی ضروری اشیاء سے محرومی کے خلاف لوگوں کی اجتماعی ناراضگی کا مظہر ہے یا یہ کہ حکومت کی ناکامیوں کے خلاف عوام کا اُسی طرح کا خود رَو اور بے ساختہ محاسبہ ہے جیسا کہ اُن ملکوں میں عمل میں آتا رہا ہے، جہاں شخصی آمریت کا دور دورہ رہا ہو۔ بلاشبہ ہوم سیکرٹری ایک ایسی رپورٹ پیش کرنے پر مجبور تھے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا یہی وجہ ہے کہ مجھے جناب والا کے سامنے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے شکنجے میں کس کر پیش کیا گیا ہے کہ مبیّنہ طور پر مَیں نے اپنے پیارے وطن کے تحفّظ کے خلاف اقدامات کئے ہیں۔ اس وطن کے خلاف جس پر بیرونی جارحیت کے وقت مَیں نے اس کے دفاع کے لئے ایسے عزم کا ثبوت دیا تھا کہ مجھے اپنے عوام کی لازوال خوشنودی حاصل ہوئی تھی۔

(۱۳) یونیورسٹی آرڈی ننس میں ترمیم پر راضی ہو کر اور، بدعنوانی کے خلاف بعد از وقت اقدامات کرنے پر تیار ہو کر حکومت نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ گڑبڑ کی اصل وجہ لوگوں کی ٹھوس مشکلات تھیں۔ کسی اسلامی تہذیب کے وہ کھاتے پیتے لوگ، جنھیں ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے دورِ قدیم نے لطافت بخشی ہو، کیونکر اچانک چند تقریروں سے آگ پکڑ کر یک بارگی یوں اُٹھ کھڑے ہوسکتے ہیں کہ گورنر موسیٰ کے الفاظ میں وہ اس حالت کو پہنچ جائیں کہ ان کی ناقابلِ تسخیر حکومت ایک ہی ہلّے میں دھڑام سے گرنے لگے۔

یہ غیر معمولی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اگر حالات معمول پر ہوتے۔ خود حکومت نے اس بات کا اقرار کیا ہے۔ کیونکہ اُس نے رسوائے زمانہ یونیورسٹی آرڈی ننس کے ضمن میں طلبہ کے بعض منصفانہ مطالبات کو مان کر یہ کوشش کی ہے کہ حالات کچھ نہ کچھ معمول پر آجائیں۔ حالات نے حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ اب وہ ایک حد تک نرم پڑ جائے۔ آرڈی ننس میں مجوزہ ترمیم کے خلاف کوئی ایک آواز بھی سنائی نہیں دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس بات کا پوری قوم مطالبہ کر رہی ہو وہ اس وقت تک نہ مانی جائے، جب تک اُسے زبردستی نہ منوایا جائے۔ اگر یہ اقدامات از خود ضروری تھے تو پھر انہیں اتنے برسوں تک ملتوی رکھنے اور طلبہ کے طبقے میں اتنی تلخی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ موجودہ اضطراب ہرگز پیدا نہ ہوتا اگر استبدادی قوانین کو روزمرّہ قانون کی حیثیت نہ دے دی جاتی۔ یہ بات قومی المیئے سے کم نہیں کہ تبدیلیاں لانے کے لئے اتنی زیادہ تلخی کی ضرورت پڑے۔ آرڈی ننس میں جو بربریت مضمر ہے اُس کا اندازہ کرنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا پروازِ تخیل کی ضرورت نہیں تھی۔ دنیا بھر میں کہیں بھی، یہاں تک کہ ہٹلر کے عہدِ حکومت میں بھی، یونیورسٹی کی سندیں ضبط نہیں کی گئیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکام پر دس سال کی اندھا دھند حماقت کے بعد اس ابتدائی حکمت کی وضاحت کے لئے موجودہ بحران کی ضرورت پڑی جس میں کئی معصوم اور نوخیز طالب علموں کی جانیں گئیں۔ یہ ہیں وہ غلطیاں جنھوں نے لوگوں کو برگشتہ کیا ہے نہ کہ میری تقریروں نے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے کس منطق کی ضرورت ہے کہ کسی ڈگری کی ضبطی، جو دراصل علم کے

عوامی مظاہرے فرسودہ نظام کے خلاف اظہارِ احتجاج ہیں

نااہل حکمران یہ نہیں سمجھتے کہ تاریخ کے دھارے کس ڈگر پر بہتے ہیں

مترادف ہے، چھینی نہیں جاسکتی، کیونکہ اس کے چھیننے کا مطلب ہے کہ کسی شہری کے دماغ پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کے بجائے خود اپنے آپ کو اُس رسوائی اور تضحیک کا ذمہ دار ٹھہرائے جو اس کی غلط کاریوں کی طویل فہرست کے باعث اس کے نام لگی ہیں۔

(۱۴) طلبہ کی طرح بقیہ آبادی کا بھی یہی حال ہے۔ مشکلات اس لئے بڑھ گئی ہیں کہ حکومت لوگوں کی ضروریات سے غفلت برتتی رہتی ہے۔ جب تک لوگوں نے مجبور نہیں کر دیا اس حکومت نے اُن کے جائز مطالبات کے پیشِ نظر اپنے آپ کوئی ایک بھی رعایت نہیں دی۔ لوگوں کے مفاد کو نظرانداز کر کے اور ان کا اعتماد کھو کر یہ حکومت بدنام ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کے مقابلے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلاؤں جبکہ لوگوں کی نفرت ایک انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف بے چینی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ لوگوں کو جمہوریت سے محروم کر دیا گیا ہے اور اقتصادی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت پر شکست خوردہ سمجھوتے بازی نے برطانوی سیکرٹری امور خارجہ کے اس بیان کو، ممکن بنایا جو اس نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں دیا تھا۔ فرخا بیراج کے بارے میں اسی نوعیت کے متزلزل مؤقف نے بھارت کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت دلادی ہے کہ گنگا بھارتی دریا ہے۔ نظم و نسق تباہ ہو گیا ہے، جرائم کی افراط ہے اور دکھوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ حضورِ والا، یہ ہیں بحران کی وہ چند علامات جنھیں اُس نوٹ کا جُز ہونا چاہیئے تھا جو ہوم سیکرٹری نے گورنر کے نام لکھا تھا۔ اگر ہوم سیکرٹری حکومت کی ڈوبتی ہوئی ساکھ کو بچانا چاہتے تھے تو انھیں اندھا دھند گرفتاریوں کی، سفارش کرنے کے بجائے اپنے آقاؤں کو مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ لوٹ مار کا سدِباب کرتے، حکمران طبقے کی غارت گری کو برائے خدا روکتے، اس بیڑے میں جوان کے نام پر صوبے کے چار دانگ میں صفیں باندھے کھڑا ہے۔ مزید بسوں کا اضافہ بند کرتے، عام آدمی کے خون اور پسینے پر مزید فیکٹریاں اور کاروبار نہ کھڑے کرتے اور اپنے نام اور اپنے چہیتوں کو مزید لائسنس جاری کرنے سے باز رہتے۔ اگر آج ملک میں آگ لگی ہوئی ہے تو یہ آگ حکومت کی بداعمالیوں ہی نے بھڑکائی ہے۔

پیراگراف نمبر ۱۵ و نمبر ۱۶ کی اشاعت کی اجازت نہیں ملی

---

(۱۷) ہر شہری کا حق ہے کہ ملک پر حکمران حکومت کی کوتاہیوں یا جس نظام کے تحت وہ زندگی بسر کرتا ہے اس پر تنقید کرے یہ بنیادی سیاسی حق ہے، اس کی کارفرمائی کا مطلب ہے کہ لوگ آزاد ہیں اور اس سے محرومی کا مطلب ہے کہ قوم غلام ہے۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے کہ وہ تبدیلیوں کی وکالت کرے خواہ یہ تبدیلیاں معاشرتی نظام سے متعلق ہوں، خواہ یہ معیشت کی تبدیلیاں ہوں۔ اگر تنقید کی اجازت نہ ہو تو کسی طرح کی سیاسی سرگرمی ممکن ہی نہیں تنقید ہر فرد اور ہر سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے۔ حکومت کا طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر اُس تنقید کو جو نشانے پر بیٹھے ڈیفنس

پولیس کے ظالمانہ رویّہ نے عوام کو انتہاپسندی کی راہ پر ڈال دیا — !!

آف پاکستان رولز کی خلاف ورزی قرار دے دے. ملک کو اُس تنقید سے کوئی خطرہ لاحق نہیں جو بدعنوانی اور جابرانہ قوانین جیسی برائیوں کے خلاف کی جاتی ہے. لوگوں کا امن جبر واستبداد سے تہ وبالا ہوا ہے تنقید سے نہیں. جابرانہ قوانین ہی شہری امن کو تہ وبالا کیا کرتے ہیں.

ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے اُس غیر معمولی قانون کے بے پناہ دائرہ کار ہیں جو ایسے حالات میں زیرِعمل لایا جاتا ہے جہاں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں کیونکہ ہم فی الحال کسی بیرونی جارح سے دوچار نہیں، قریب قریب ہر اس لفظ یا روئیداد کے بارے میں جو سرکاری کانوں پر گراں گزرتی ہو. تشدد پر ابھارنے کا الزام لگا دیا جاتا ہے. لوگوں کے امن و امان کا تحفظ بڑا نفیس بہانہ ہے. دس سال کی روز افزوں بدحالی نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اس میں لوگوں کے امن و امان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. امن دامان کو لوگوں کی فطری مدافعت نے نہیں بلکہ حکام کے ایجنٹوں کے تشدد نے تہ وبالا کیا ہے. اس کا الزام مجھ جیسے لوگوں پر تھوپا جو بنیادی وجوہ کو دور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں.

(۱۸) مَیں باضابطہ حکومت میں یقین رکھتا ہوں، طرزِ عمل کے مہذب معیاروں میں یقین رکھتا ہوں، معاشرتی اور اقتصادی انصاف میں یقین رکھتا ہوں، جمہوریت کی صحیح رُوح میں یقین رکھتا ہوں، عوام کی اُس مسرت میں یقین رکھتا ہوں جو انسانی حقوق سے کامل طور پر بہرہ ور ہونے سے اُبھرتی ہے. مجھے علم ہے کہ تشدد کے کیا کیا سرچشمے ہیں. مجھے یہ بھی علم ہے کہ یہ سرچشمے اُس وقت نہیں پھوٹتے جب لوگ آسودہ حال ہوں. دنیا میں بہت کم قومیں ایسی ہوں گی جو اتنی باصبر ہوں، دُکھ اور ناانصافی جھیلنے کی اسقدر برداشت رکھتی ہوں جتنی کہ پاکستانی قوم. اس نے دس طویل برسوں تک اس حکومت کو برداشت کیا ہے. لیکن یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ دس سال کے اوائل میں حالات اتنے بُرے نہ تھے اور امید کی ایک کرن موجود تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات خراب تر ہوتے چلے گئے اور اُمید کی کرن ڈوب گئی. اب یہ نوبت ہے کہ عوام حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں. تشدد یا عدم تشدد کا اس صورت حال سے کوئی تعلق نہیں. یہ جانی پہچانی بات ہے کہ پولیس کے ظالمانہ رویے کے سامنے عوام کا ردِعمل لازمی طور پر تشدد ہی ہو گا. ان دنوں اکثر یہ ہوا ہے کہ عوام کو کچوکے دے دیکر انتہاپسندی کی راہ پر ڈالا گیا ہے. ان کے بچوں کو پولیس نے مارا پیٹا ہے، گولیوں کا نشانہ بنایا ہے، قتل کیا ہے. یہ حقائق ہیں. طالب علموں کو شہید کیا گیا ہے. مَیں نے تو پولیس کو نہیں اکسایا تھا کہ طالب علموں کو قتل کرے

(۱۹) حکومت طلباءؔ پر میرے اثر ورسوخ کے بارے میں بہت حساس ہے. نوجوان لوگ شاید میری جانب اسلئے متوجہ ہوتے تھے کہ مَیں ان کے مسائل کو سمجھتا ہوں، اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہوں. مَیں اس بات کو کوئی، خوفناک غلطی نہیں سمجھتا: آخر وہ ہماری آبادی کا جزو لاینفک ہیں، ہماری قوم کا گلِ سرسبد ہیں، ہمارے مستقبل کی امید ہیں. حکومت کے پاس ان کے مطالبات کا جواب یہ رہا ہے، کہ اُس نے تمام تعلیمی ادارے بند کر رکھے ہیں. کسی مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کا یہ عجیب وغریب طریقہ ہے. ظاہر ہے کہ اگر سکول اور کالج ہی نہ ہوں گے تو طالب علم بھی نہ ہوں گے. اور پاکستان کی آئندہ نسل ماشاءاللہ ناخواندہ ہوگی. اگر عوام کا امن وامان اسی قیمت پر خریدا جاسکتا ہے تو یہ امن وامان کوئی وقعت نہیں رکھتا.

(۲۰) مَیں عرض کرتا ہوں کہ حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ طلباءؔ کے مطالبات مبنی برحقیقت تھے اور ان میں جان تھی خود صدر صاحب نے بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے. انہوں نے یونیورسٹی آرڈی ننس میں ترمیم کرنے کا وعدہ کیا ہے اصل میں انہوں نے مان لیا ہے کہ طلباءؔ کے خلاف حکومت کا جابرانہ اقدام غلط تھا اور طلباءؔ کو بہت بجا شکایات تھیں. اگر طلباءؔ اپنی شکایات میں بجا تھے تو پھر مَیں نے ان کی جو تائید کی تھی وہ

بھی غلط نہیں ہو سکتی. اس بات کو صدر صاحب نے اپنی مبینہ " رعایات" کی صورت میں خود تسلیم کیا ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو عید الفطر کے موقع پر قوم کے نام پیغام میں صدر ایوب نے کہا تھا:

"ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیئے کہ غلط فہمیاں، وسوسے، شکوک اور شبہات ہم میں پھوٹ ڈال دیں. سب سے بڑھ کر ہمیں یہ سیکھنا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کریں نظریاتی اختلاف کو تلخی اور تشدد میں نہیں ڈھلنا چاہیئے"۔

اگر ان نجیب احساسات کو بروئے عمل لایا جاتا تو یہ اور بھی لائق تحسین بن جاتے۔ لیکن حکومت ان کے برعکس عمل پیرا ہے۔ اس کا وطیرہ طعنہ زنی، الزام تراشی اور گالی گلوچ ہے۔ وہ اپنے کرائے کے غنڈوں کو ملتان کے جلسے میں تلواریں دے کر بھیجتی ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کریں اور اس شہر (لاہور) کے ایک جلسے میں مجھے جسمانی طور پر مجروح کراتی ہے۔ دن دہاڑے، پولیس کی ساز باز سے، وہ قومی شاہراہ پر زبردستی میرا راستہ رکواتی ہے۔ تاکہ کلہاڑیوں سے مجھ پر حملہ کیا جائے اور پھر مسلح ڈاکوؤں کو میرے گاؤں بھیجتی ہے۔ تشدد کی ان خرمستیوں سے بھی اس کا پیٹ نہیں بھرتا تو ملتان کے مسلم لیگیوں کی گورنر مغربی پاکستان کی طرف سے گوشمالی کی جاتی ہے کہ وہ اس علاقے میں میرے دورے کے دوران میری ٹھیک طرح سے خبر کیوں نہ لے سکے۔ اس موقع پر موجود حاضرین میں سے ایک فرد کی بیباکی ملاحظہ ہو کہ اُس نے گورنر کو بتایا کہ اس ضمن میں انہوں نے مجھے جان سے مارنے سے اِدھر اُدھر اپنی سی کوشش کی تھی "ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے" اور "نظریاتی اختلاف کو تلخی اور تشدد میں نہ ڈھلنے دینے" کا یہ بہت نفیس طریقہ ہے۔ اگر ضابطۂ اخلاق واقعی یہی ہوتا تو مجھے محض اس بناء پر نشانۂ ستم کیوں بنایا جاتا کہ مجھے حکومت سے سیاسی اختلافات تھے؟

(۲۱)۔ نااہل حکمران یہ نہیں سمجھتے کہ تاریخ کے دھارے کس ڈگر پہ بہتے ہیں اس لئے وہ اپنی مشکلات کو اُس فرد کی ریشہ دوانیوں کے سر تھوپ دیتے ہیں جو انہیں سب سے زیادہ ناپسند ہوتا ہے۔ اگر طلباء کوئی مشکل پیدا کریں تو وہ سوچتے ہیں کہ ضرور کوئی نہ کوئی انہیں بھڑکا رہا ہے۔ یہ نوجوان اور خصوصاً طلباء کی خاصیت معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ حالات کو یکسر بدلنے کی خواہش کے اظہار کا، تاریخی منصب ادا کرتے ہیں۔ لیکن حکمرانوں کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ تبدیلی کے امکان کو کچلنے کی توقع میں طلباء کو کچلنے لگتے ہیں. حکومت عوام کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ راوی چین لکھتا ہے اور حالات بے حد اچھے ہیں، بس کچھ "شورش پسند" اور "دنگے باز" ہیں جو "جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کو گمراہ" کرتے رہتے ہیں.

(۲۲) حکومت نے مجھے بے ہودہ طور پر ہراساں کرنے اور بالآخر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دینے کی جو روش اختیار

حکومت کی ڈوبتی ہوئی ساکھ بچانے کے لئے اندھا دھند گرفتاریاں کی گئیں

کی ہے اس کی بناء ان دو حقیقتوں پر ہے:

(الف) اُسے یہ خوف تھا کہ تاشقند کے مسئلے کو پاکستان کے عوام کے سامنے ان کے فیصلے کے لئے لا کھڑا کر دوں گا۔ اور

(ب) صدر ایوب خاں کو یقین ہے کہ مَیں صدارت کے ضمن میں ان کا سب سے طاقتور حریف ہوں کیونکہ ان کے برعکس مجھے عوام کا اعتماد حاصل ہے.

مجھے محض اس بناء پر اندھا دھند جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے کہ جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند پر حکومت اور میرے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے. میری تقریریں اور اس وقت کے حالات جیل میں میری نظر بندی کا اصل باعث نہیں میری نظر بندی کا اصل باعث یہ ہے کہ مجھے اس علم کو عام سیاسی میدان سے الگ کر کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صدر کے عہدے پر فائز رہنے کا حتمی انتظام کر رہے ہیں۔ یہ ہے میری نظر بندی کی اصل وجہ نہ کہ نظر بندی کی وجوہ کے میمورنڈم میں درج شدہ وہ الزامات جن کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے. میرے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بدنیتی پر مبنی ہیں۔

(۲۳) میرے اور صدر صاحب کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اور بعد ازیں اور بالآخر تاشقند میں سنگین اختلافات ابھر آئے تھے۔ ان غیر معمولی حالات میں جنہیں میری اچھی بھلی صحت کے سر منڈھا گیا جب مَیں نے حکومت کو خیر باد کہا تو ۱۶ جون ۱۹۶۶ء کی شام کو صدر صاحب نے مجھے اپنے گھر بلوایا. شروع شروع میں صدر صاحب خوشگوار رہے۔ مَیں نے پاکستان کی جو خدمت کی تھی اس پر انہوں نے میری بے حد تعریف کی۔ قدر افزائی کے طور پر انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کیا مَیں فرانس یا اپنی پسند کے کسی دوسرے ملک میں، خصوصی شرائط پر، سفارتی عہدہ قبول کر سکوں گا. مَیں نے اس پیش کش کے لئے صدر کا شکریہ ادا کیا، لیکن اسے رَد کر دیا۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ ایک ہنگامہ خیز دَور میں آٹھ سال تک وزیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد قومی زندگی میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے مَیں اپنی زمینوں پر واپس جانا چاہتا ہوں۔ صدر نے اس خیال کو سراہا اور از راہِ عنایت تجویز کیا کہ مجھے لاڑکانہ میں چینی یا پٹ سن کا کارخانہ قائم کر لینا چاہیئے. وہ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے. کہ حکومت اس منصوبے کے ضمن میں ہر سہولت دے گی۔ مَیں نے ایک مرتبہ پھر صدر کی عنایت کا شکریہ ادا کیا کہ مَیں اسی بات کو ترجیح دوں گا کہ اپنی سرگرمیوں کو اس پیشے تک محدود رکھوں جس سے میرا خاندان نسل در نسل متعلق رہا ہے۔ اس پر صدر نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ انہوں نے مجھے سختی سے یاد دلایا کہ مَیں "نازو نعمت میں پلنے والا ایک نوجوان ہوں.

پاکستانی قوم۔ دنیا کی سب سے زیادہ صابر قوم ہے

تک لانے سے روک دیا جائے کہ اعلان تاشقند کیسے اور کیوں کر وجود میں آیا. حکومت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ صداقت سے پردہ اٹھا دیا جائے. کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو صدر صاحب خواہ جو جتن چاہیں کر لیں کسی صورت بھی تیسری مرتبہ منتخب نہیں ہو سکتے. مجھے جیل میں محبوس کر کے اور یوں

اور مَیں نے زندگی کے تھپیڑے نہیں سہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ان کا مطلب کیا ہوتا ہے. چنانچہ انہوں نے کہا وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مجھے واضح طور پر تنبیہ کر دیں کہ اگر پاکستان واپس آ کر مَیں نے سیاست میں حصہ لیا تو یہ میرے لئے مصیبت کا باعث ہو گا۔ بات کو پوری طرح

واضح کرتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر میں نے ان کی دشمنی کو مول لیا تو وہ مجھے "قبر تک نہ چھوڑیں گے۔" ڈرانے دھمکانے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہوئے میں نے صدر صاحب سے نرمی سے کہا کہ جہاں تک سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں میرے فیصلے کا تعلق ہے اس کا انحصار قومی مفاد پر ہے نہ کہ دھمکیوں پر۔ یہ غیر مبہم جواب پاکر صدر صاحب اپنے پہلے رویّے کی جانب لوٹ گئے اور انہوں نے تجویز کیا کہ تمام معاملات کو ایک ہی دن چھاننے پھٹکنے کی کوئی جلدی نہیں انہوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کردی کہ ان امور کے بارے میں یورپ سے واپسی پر بات چیت ہو جائے گی.

(۲۴) یورپ میں ہمارے بہت سے سفیروں نے مجھے صدر صاحب کی شرائط قبول کرنے کے لئے طرح طرح کی ترغیب انگیز پیش کش کی. ان کے کہنے کے مطابق میں ابھی اتنا جوان تھا کہ وقتی طور پر سیاست کو بھلا کر بعد از ایوب دور کا انتظار کر سکتا تھا. ان کے مشورے نے کئی روپ دھارے. مسٹر عبدالرحمٰن خان جو مغربی جرمنی میں ہمارے سفیر اور صدر صاحب کے برادرِ نسبتی ہیں. صلح صفائی کی کوشش میں سب سے زیادہ سرگرم تھے. جب میں اکتوبر ۱۹۶۶ء میں واپس آ رہا تھا تو میں کابل میں چند دن رک گیا. میں ابھی وہیں تھا کہ مجھے ڈائریکٹر انٹیلیجنس

بیورو، مسٹر ایوب اعوان کی جانب سے پیغام ملا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ راولپنڈی میں قیام کے دوران میں اُن کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ جب میں پشاور پہنچا تو ڈی آئی جی پولیس مسٹر انور آفریدی ہوائی اڈے پر مجھ سے ملے تاکہ تصدیق کریں کہ کیا میں نے مسٹر اعوان کی دعوت قبول کر لی ہے میرے پنڈی پہنچنے کے اگلے دن مرحوم الطاف حسین جو اسوقت وزیر صنعت تھے اور جن سے میرے اچھے مراسم تھے۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے تاکہ بقول ان کے "دل بہ دل" بات چیت ہو جائے۔ وہ ایک تجویز لے کر آئے تھے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "معقول" ہے اور مجھے قبول کر لینی چاہیئے۔ تجویز یہ تھی کہ میں "خاص رعایت" کے طور پر عملی سیاست میں حصہ لے سکتا ہوں، بشرطیکہ ایک یا دو چبھتے ہوئے موضوعات سے گریز کر دں اور صاف صاف وعدہ کروں کہ ۱۹۷۰ء میں صدارتی انتخاب میں ذاتی طور پر حصہ نہیں لوں گا۔ میں نے مسٹر الطاف حسین کو بتایا کہ انتخابات ابھی بہت دور ہیں اور جس نوعیت کی یقین دہانی وہ مجھ سے چاہتے ہیں انہیں دینے سے قاصر ہوں۔

اسی شام اپنے ڈنر کے دوران مسٹر اعوان کئی ترغیب انگیز تجاویز سامنے لائے مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں پاکستان مسلم لیگ میں نمایاں حصہ لیتا رہوں، مجھے اس بات کی آزادی ہوگی کہ میں عوامی سطح پر خارجہ پالیسی پر تعمیری تقریریں کرتا رہوں البتہ جنگ اور تاشقند پر زبان نہ کھولوں۔ ان کے بقول میری حیثیت صدر کے غیر سرکاری مشیر کی سی ہوگی۔ اس طرح مجھے بعض ممالک میں صدر کے سفیر کی حیثیت سے خصوصی مناصب کے لئے دورے کا بھی موقع ملے گا۔ میں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کی تجاویز رد کر دیں۔ رخصت ہونے سے قبل مسٹر اعوان نے مجھے تنبیہہ کی کہ اس صورت میں مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔

(۲۵)۔ نومبر ۱۹۶۶ء میں، جب صدر صاحب انگلستان میں سرکاری دورے پر تھے، میں ڈھاکے سے واپس آتے ہوئے لاہور میں رکا۔ مسٹر اختر ایوب جو صدر صاحب کے سب سے بڑے لڑکے ہیں، میرے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دو بار مجھ سے ملنے آئے اور صلح صفائی کے لئے وکالت کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس مقصد کے لئے گورنر موسیٰ مجھے دعوت دینے کے آرزو مند تھے اور انُ سے کہا تھا کہ رسمی طور پر دعوت دینے سے پہلے یہ پتا لگائیں کہ میں اسے قبول کروں گا یا نہیں۔ میں نے مسٹر اختر ایوب سے کہا کہ وہ گورنر موسیٰ سے کہہ دیں کہ وہ اور میں آٹھ سال تک اکٹھے کام کرتے رہے ہیں اور انہیں اس طرح کا تکلّف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں گورنر موسیٰ سے ملا اور وہ صدر صاحب کی واپسی پر ان سے "صلح صفائی" کر لینے کی نصیحت کر چکے، تو انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تاشقند پر زبان کھولنے سے احتراز کروں۔ اگر اس بات کو گورنر کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس کی شکل کچھ یوں ہو گی:-

"یہ سب رفت گزشت ہو چکا ہے لہٰذا اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر صدر صاحب بھی انسان ہیں، وہ اس بات کو کیوں کر برداشت کر سکتے ہیں۔"

میں نے مسٹر موسیٰ سے کہا کہ میں نے صدر صاحب کے ساتھ خاصی لمبی مدت کام کیا ہے اور بخوبی جانتا ہوں کہ جن لوگوں نے ان کی ناراضگی مول لی ان سے انہوں نے

حکومت کی
کوشش تھی کہ
جنگ بندی اور
اعلان تاشقند کو
سیاسی مسئلہ نہ بنایا جائے

کس طرح کا سلوک کیا لیکن اس کے باوجود بعض امور ایسے ہیں جنہیں قوم سے نہیں چھپایا جا سکتا اور تاشقند بھی ایسا ہی مسئلہ واقع ہوا ہے۔

(۲۶)۔ اگلی پیش قدمی پھر مسٹر اختر ایوب اور انکے چھوٹے بھائی طاہر ایوب نے ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ء یا اس سے لگ بھگ کی جب وہ کراچی میں میرے گھر آئے اور سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی۔ جب میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا کہ انہیں اس طرح کی بات کرنے کا آخر اختیار ہی کیا ہے۔ تو انہوں نے پُرزور الفاظ میں بیان کیا کہ اگر انہیں اپنے والد کی منظوری حاصل نہ ہوتی تو وہ میرے گھر آنے اور اس موضوع پر بات کرنے کی جراَت بھی نہ کرتے۔

(۲۷) موجودہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس، مسٹر رضوی، نے انکے تتبع میں مئی ۱۹۶۷ء میں ایک اور کوشش کی، جب وہ کراچی میں میرے پاس آئے تاکہ مجھے یہ ذہن نشین کرائیں کہ صدر صاحب کے لئے ۱۹۷۰ء میں تیسری مرتبہ صدر بننا کیوں ضروری ہے۔ ایک ماہ بعد انہوں نے اس نکتے پر مزید زور دیا جب وہ دوبارہ مجھ سے لاہور میں ملے۔ یہ گول باغ کے اُس اجتماع عظیم سے میرے خطاب سے ایک روز قبل کا واقعہ ہے جب میرے تقریر شروع کرنے کے چند منٹ ہی بعد حکومت نے زبردستی تہ و بالا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

(۲۸)۔ ڈور کا سرا ایک مرتبہ پھر مسٹر عبدالرحمٰن خاں، سفیر برائے جرمنی، نے اٹھایا۔ جب میں اگست ۱۹۶۷ء میں لندن گیا۔ ایک سال بعد، مئی ۱۹۶۸ء میں، مسٹر رضوی مجھ سے دوبارہ کراچی میں میری رہائش گاہ پر اُسی مقصد کے تحت ملے جو ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے موسم گرما کی ملاقاتوں میں مسٹر عبدالرحمٰن خاں کے پیش نظر تھا اور جس کے سلسلے میں انہوں نے اگست ۱۹۶۸ء میں بھی اصرار کیا جب بون میں وہ مجھ سے دوبارہ ملے۔

(۲۹) حکومت نے پچھلے اڑھائی سال میں لگاتار جتنی بھی پیش قدمیاں کی ہیں ان کا مرکزی نقطہ یہ طے شدہ کوشش رہی ہے کہ:-

(الف) مجھے اس بات سے روکا جائے کہ میں جنگ بندی اور تاشقند کو سیاسی مسئلہ بناؤں۔

(ب) میں صاف صاف یقین دہانی کراؤں کہ میں ۱۹۷۰ء کے صدارتی انتخابات نہیں لڑوں گا۔

جب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ میں پسپائی اختیار نہیں کروں گا تو ساتھ ساتھ ستم کشی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ یہ بڑھتے بڑھتے ظلم کی حدوں میں داخل ہو گئی۔ وہ واحد ایبڈو زدہ سیاستدان جسے وزیر بنایا گیا ہے میرے ضلع سے تعلق رکھتا ہے۔ اُسے امور داخلہ کا قلمدان سونپا گیا ہے تاکہ مجھے سرنگوں کرے۔

(۳۰) جس طریقے سے مجھے مشق ستم بنایا گیا ہے اسکی ہر تفصیل پیش کرنے کے بجائے، عدالت کی سہولت کیلئے میں اُس ستم کشی کی صرف خاص خاص صورتوں پر اکتفا کروں گا، جو حکومت نے میرے خلاف روا رکھی ہے:-

(الف) میری ذات پر تشدّد آمیز جسمانی حملے۔

(ب) مجھے اور میرے خاندان کو مالکانہ حقوق سے محروم کرنے کی کوششیں۔

(ج) جھوٹے مقدّموں میں ملوث کرنا اور ان سلسلوں کے ضمن میں انصاف کے حصول میں مداخلت۔

(د) دیگر ذرائع سے شخصی سطح پر ہراساں کرنا۔

(ہ) میری سیاسی سرگرمیوں میں مداخلت اور میرے سیاسی حامیوں پر ستم کشی۔

تھے، مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اب میرا خاتمہ قریب آگیا ہے اور میں اس جگہ سے زندہ بچ کر نہ جاؤں گا۔ مجھے مجمع عظیم کے اس حصے نے بچایا جس نے ان غنڈوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا جب کہ وہ مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر رہ گئے تھے اس جھڑپ میں نہ صرف ہجوم کے متعدد شرکا، بلکہ چند "کرایہ دار" بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ انتظامیہ کی بالائی سطح جو ڈی آئی جی، ڈی سی، ایس پی اور دوسروں پر مشتمل تھی اُس نے اس گڑبڑ کا قطعے کے ایک مقام نظر سے تماشا کیا لیکن مداخلت کی ضرورت نہ سمجھی۔ جب لوگوں نے انتشار پسندوں پر قابو پا لیا تو پولیس پھرتی سے حرکت میں آگئی مگر محض اس لئے کہ زخمی "کرایہ داروں" کو اُٹھا لے جائے اور جلد از جلد ہسپتال میں داخل کرا دے جو لوگ ہجوم میں سے زخمی ہوتے تھے نہ تو پولیس نے اُن کی کوئی مدد کی اور نہ انہیں ہسپتال میں داخلہ ملا۔

الف آٹھ ماہ قبل کچھ اجنبی میرے گاؤں میں آوارہ گردی کرتے دیکھے گئے۔ انہیں مشتبہ پاکر بعض گاؤں والے انکے پیچھے لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ چلتے کی ایک دکان میں جا پہنچے۔ جب ان لوگوں نے میرے گھر کا ایک نقشہ میز پر بچھایا تو ان کا تعاقب کرنے والے افراد ان پر جھپٹ پڑے اور گھر کا نقشہ چھین لیا، ساتھ ہی وہ دستی بم، اور پستول بھی چھین لئے جن سے یہ لوگ مسلح تھے۔ وہ انہیں تھانے لے گئے۔ جہاں انہیں اور اس تمام اسلحے کو جو اُن سے چھینا گیا تھا حوالۂ پولیس کر دیا گیا۔ بظاہر اپنے افسروں کی ہدایات پر تھانے دار نے ان سب لوگوں کو رہا کر دیا۔ یہ واقعہ اخبار "کمنٹ" میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ابھی تک اس کی تردید نہیں کی گئی۔

ب میں اور میرا خاندان زرعی اصلاحات کے تحت اپنی بہت سی زرعی املاک سے دستکش ہو گئے تھے۔ اسکے باوجود وزیر داخلہ کی شہ پر مجھے ہراساں کرنے کے لئے بعض لوگوں کی جھوٹی درخواست پر بار بار تفتیش کرائی جاتی ہے۔ تاکہ میرے نابالغ بچوں کو ان کی زرعی املاک سے محروم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں لاڑکانہ کے تین ڈپٹی کلکٹروں نے چار مختلف موقعوں پر تفتیش کی ہے، اور الزامات کو بے بنیاد پایا ہے۔ ان کے نتیجہ تحقیقات کے باوجود ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ اور کمشنر خیرپور نے ہر بار اصرار کیا ہے کہ از سرِ نو تفتیش کی جائے۔ اگرچہ یہ تفتیشات ہماری املاک سے متعلق ہیں اور عدالت ہائے مال کے زیرِ اہتمام انجام پائی ہیں جن میں وکلا پیش ہوتے ہیں، بیانات درج ہوئے ہیں، گواہوں پر جرح ہوئی ہے اور دستاویزوں کی جانچ پڑتال کی گئی ہے لیکن عدالت کے نتیجہ تحقیقات کی نقول ہمیں مہیا کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے یہی نہیں، محکمہ انسداد رشوت ستانی کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے طور پر الگ اس مسئلے کی تفتیش کرائے ___ کسی مبینہ طور پر ستم زدہ کی طرف سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر نہیں، بلکہ لاڑکانہ میں حیدرآباد کے ایک پولیس انسپکٹر کی جانب سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر۔ وزیر داخلہ نے بار بار یہ سرِ عام کہا ہے کہ میں نے غریب مزارعین کی زمین غصب کر لی ہے حالانکہ یہ بات ان حقائق کے منافی ہے جن کی تصدیق عدالت ہائے مال کے نتیجہ تحقیقات سے اور زرعی اصلاحات کی نظامت کے احکامات سے ہوتی ہے۔ یہ اقدام اس دُہرے مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ مجھے بدنام کیا جائے اور حصولِ انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جائے۔

ب۱ اپریل ۱۹۶۸ء میں لاہور اور حیدر آباد کے بیسیوں سرکاری افسروں کو لاڑکانہ میں اس کام پر متعین کیا گیا کہ وہ میرے پورے خاندان کی جس میں میرے سب چچا اور چچیرے بھائی بہن بھی شامل ہیں، املاک سے متعلقہ ریکارڈ اور دستاویزیں حاصل کر لیں جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہمیں ہماری املاک سے محروم کرنے کے ذرائع ڈھونڈے اور راہیں تراشی جائیں۔

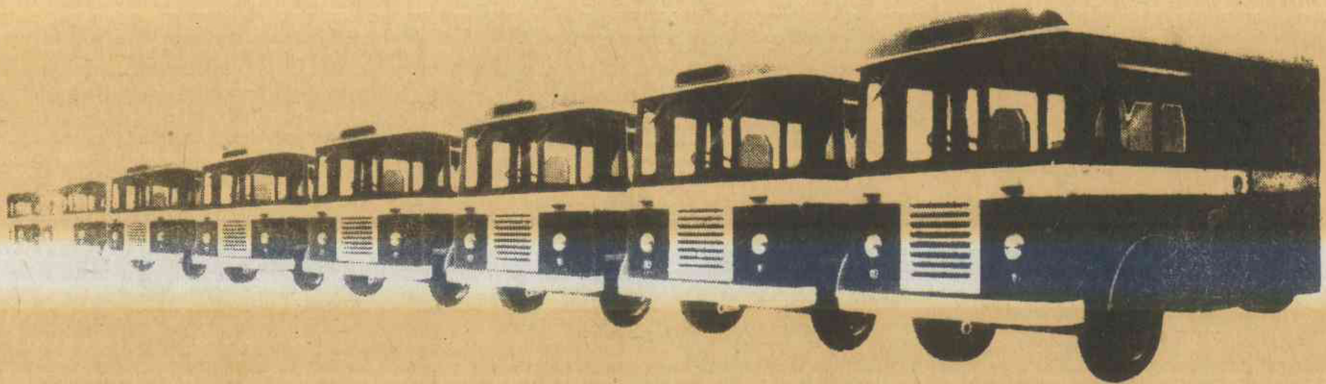
ب۲ جب تک حکومت نے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں چاول کی نقل و حمل پر پابندیاں نہ لگا دیں۔ پالیسی یہ تھی کہ خریداری کی حد پوری ہونے کے بعد چاول کی فروخت کے پرمٹ جاری کر دیئے جاتے تھے۔ سوائے ان معدودے چند موقعوں کے جب حکومت کو فوری ضرورت پڑ گئی۔ ہماری ۱۹۶۷ء کی چاول کی فصل نہ تو خریدی گئی اور نہ اس کی فروخت کیلئے پرمٹ جاری کیا گیا۔ ہماری آمدنی کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ ہمیں شدید مالی مشکلات کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہاں تک کہ حکومت نے عام پالیسی کے طور پر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں چاول کی نقل و حمل سے پابندیاں اٹھا لیں۔

ب۳ حکومتِ پاکستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے اُن اعلانات کو منسوخ کرتے ہوئے جن کے تحت مجھے اسلحہ رکھنے کے ضمن میں لائسنسوں کی ضرورت نہیں تھی یکطرفہ کارروائی کی۔ اس کارروائی کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے حکم دیا کہ میرا تمام لائسنس یافتہ اسلحہ ضبط کر لیا جائے۔ یہ حکم ہلالِ پاکستان کے ایوارڈ کے دائرے میں آنے والے ہتھیاروں پر بھی حاوی تھا بلکہ سجاوٹی ہتھیاروں اور اُن قدیم ہتھیاروں پر بھی جو آرمز آرڈیننس کی زد میں نہ آتے تھے۔ کراچی ہائی کورٹ نے حکومت کی اس تمام تر کارروائی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ جیسا کہ عدالت عالی وقار نے فیصلہ دیا ہوم سیکرٹریٹ نے غیر قانونی احکام جاری کیے تھے جو اسلحہ ضبط کر لینے کے مترادف تھے۔ جب یہ معاملہ ہائی کورٹ میں زیر غور تھا تو اس دوران میں بھی ایک درخواست کے ذریعے جسے ہوم سیکرٹری کے حلفیہ بیان کی تائید حاصل تھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ حالتِ موجودہ کی منسوخی کا حکم حاصل کر لیا جائے تاکہ حکومت عدالت عالی وقار کے فیصلے سے قبل ہی میرے ہتھیار چھین لے، یہی نہیں بلکہ جب ہائیکورٹ نے حالتِ موجودہ قائم رکھنے کا حکم دیدیا تب بھی ڈی ایس پی مسٹر قادری جو ٹریکٹروں کے مقدمے کے انچارج تھے، میرے گھر آئے اور اُنہوں نے اتنی بے باکی کا مظاہرہ کیا کہ مجھے حکم دیا کہ میں اپنے تمام ہتھیار ان کے حوالے کر دوں۔

ج : حکومت نے مجھے یکے بعد دیگرے مختلف مقدمات میں ملوث کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ان مقدمات کی پیروی اور عذر داری میں اس قدر الجھا دیا جائے کہ میں ان سیاسی امور پر توجہ مرکوز نہ کر سکوں جنہیں ملک میں اولین حیثیت حاصل ہے۔

ج ٹریکٹروں کا بدنام مقدمہ کھڑا کرنا بھی میرے ساتھ حکومت کی بدنیتی کے ضمن میں ایک متعلقہ شہادت ہے اس مقدمے کے چند انوکھے پہلو جو کراچی ہائی کورٹ کی جانچ پڑتال اور غور و فکر سے گزر چکے ہیں اس بات میں کسی بھی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہنے دیتے کہ حکومت میری سیاسی تباہی کے لیے آخری حد تک بھی جائے گی۔ میرے بارے میں صریح دھوکے باز اور جعلسازی کا معین ہونے کے جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب میری ناچیز قومی خدمات کے اعتراف میں مجھے ہلالِ پاکستان کے اعلیٰ سول ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اور بعد میں میں نے جو کوششیں کی تھیں، انہیں پوری قوم نے سراہا تھا۔ جس میں پاکستان کے صدر محمد ایوب خان اور چیف جسٹس مسٹر جسٹس اے آر کارنیلیس بھی شامل ہیں۔ اس مقدمے میں جو سرکاری ملازمین وعدہ معاف گواہ بن گئے ہیں، انہیں نہ صرف ملازمت پر بحال رکھا گیا بلکہ انہیں ترقی بھی دے دی گئی۔ اگرچہ یہ مقدمہ اگست ۱۹۶۷ء میں ایک بالکل اجنبی شخص کی جانب سے گورنر مغربی پاکستان کے نام براہ راست شکایت کی بنیاد پر کھڑا گیا لیکن یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ مقدمے کے ضمن میں چارج شیٹ یکم نومبر ۱۹۶۸ء کو جاری کی گئی۔ عدالت نے ۱۵ نومبر کو پہلی پیشی مقرر فرمائی تھی اور قانونی طور پر مجھے حاضرِ عدالت ہونا تھا، لیکن ۱۳ نومبر کو گرفتاری کے باعث معذور تھا بعد ازیں عدالت کی جانب سے ۱۴ دسمبر کو حاضری کے وارنٹ جاری

پاکستان میں بسیں فراہم کرنے والا
سب سے بڑا ادارہ



دنیا کے بہترین بس چیسز
پیش کرتا ہے

فروری ۱۹۷۴ء کے بعد
بس چیسز کے لئے
آج ہی آرڈر بک کرائیں

ریپبلک موٹرز لمیٹڈ

ڈی۔۲۰۔ سائٹ۔ کراچی ۱۶ فون:- ۲۹۲۶۰۹



سیلز دفاتر
کراچی
۱۰۔ گارڈن روڈ
فون:- ۷۷۵۵۶، ۷۰۰۸۱

حیدرآباد
ٹھنڈی سڑک
فون:- ۲۳۹۳۰، ۲۵۸۵۰

ملتان
ایل۔ ایم۔ کیو روڈ
فون:- ۵۸۷۵

لاہور
شاہراہ قائداعظم
فون:- ۵۲۲۷۲، ۵۳۷۳۳



بقیہ

مسٹر بھٹو کا حلفیہ بیان

میرے وکلا کو مجھ سے ملنے کی اجازت دیدی ہے تو میں نے فوری طور پر کچھ کاغذ مانگا تاکہ میں ان سے ملاقات کے لیے کچھ اندراجات تیار کرلوں۔ میری بار بار کی درخواستوں کے باوجود مجھے ۱۸ ؍نومبر کی سہ پہر تک تحریری کاغذ دیا گیا میرے نام خطوط اور تاریں مجھے نہ پہنچائی گئیں۔ "پاکستان ٹائمز" اور "مشرق" کے سوا مجھے کوئی اور اخبار مہیا نہ کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عالی وقار ہائیکورٹ نے حکم دیا تھا کہ تمام نظربندوں کو ایک ہی جیل میں رکھا جائے۔ ۱۸ ؍نومبر کی شام کو مجھے ساہیوال کی جیل میں لے جایا گیا جہاں میں ۱۹ ؍نومبر کی ابتدائی گھڑیوں میں پہنچا۔

نمبر ۲ میری نظربندی کے لیے ساہیوال جیل میں جو انتظامات کیے گئے وہ بے قاعدہ تھے اور وہاں بھی مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا۔ یہاں چوہوں کی جگہ کمرہ چمگادڑوں سے بھرا ہوا تھا اور اُن سے بچنے کے لیے میں اپنے چہرے پر تولیہ لپیٹ کر سوتا تھا۔ مچھروں اور مکھیوں کی بھرمار تھی۔ غسل خانہ کوٹھڑی سے الگ تھا اسے اور لوگ بھی استعمال کرتے تھے جیل کا دستور ہے کہ اے اور بی کلاس کے نظربندوں کو ذاتی خدمت کے لیے ایک قیدی دیا جاتا ہے۔ مجھے جو مشقتی دیا گیا اسے کہا گیا کہ اگر اس نے مجھ سے بات کی تو اس کی کھال کھینچ دی جائے گی

(باقی آئندہ)

بقیہ

پیپلز پارٹی - ایک جائزہ

[illegible] قرار دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی فتح سے [illegible] کی تاریخ کا رخ پلٹ گیا اور ملک میں جمہوری عمل کی راہ ہموار ہوگئی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد بیرونی ملکوں میں بھی پاکستان کا وقار بلند ہوا اور ملک میں جمہوری استحکام کی امید پیدا ہوگئی لیکن بدقسمتی سے پاکستان کو اپنی تاریخ کے سب سے بے وقوف سربراہ یحییٰ خان کی حکومی بھگتنی پڑی۔ اس شخص نے مشرقی پاکستان کی صورتحال کو بری طرح خراب کیا اس کے نتیجے میں ملک کے ٹکڑے ہوگئے۔ قوم کو اپنی تاریخ کی سب سے بڑی شکست سے دوچار ہونا پڑا جس سے لوگوں کے حوصلے بھی پست ہوتے مختصر یہ کہ جب پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت حکومت کو جو مراحل درپیش تھے وہ اس خوفناک حد تک مشکل تھے کہ الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

سیاسی خیال آرائی کرنے والے کہتے تھے کہ پی پی پی کی حکومت چند مہینے بھی چل سکے گی۔ پارٹی کو حکومت ملی، تو خزانہ خالی تھا۔ سرزمین وطن پر دشمن کے سپاہی کھڑے ہوئے تھے اور ۹۳ ہزار جنگی قیدی بھارتی کیمپوں میں محصور تھے۔ کام بہت بڑا تھا۔ لیکن جناب ذوالفقار علی بھٹو کا عزم بھی نہایت پختہ تھا۔ اُنہوں نے قوم کو اس سیاسی دلدل سے نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں جس نے تمام امیدیں ختم کردی تھیں اور تحفظ و سلامتی کے امکانات معدوم کر دیے تھے۔ مسٹر بھٹو اور خود پارٹی کو اُن وعدوں کا پاس بھی تھا جو انہوں نے عوام سے انتخابات کے موقع پر کیے تھے۔ قوم نے پارٹی کو اختیار دیا تھا، وہ اُس کے تقاضے جانتے تھے۔ حکومت نے اپنا کام نہایت عزم اور ہوشیاری کے ساتھ شروع کیا۔ پہلی اہمیت اُن مسائل کی تھی جو بھارت کے ساتھ جنگ کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے۔ مذاکرات اور سفارت کاری کے ذریعہ بالآخر حکومت مقبوضہ علاقے خالی کرانے اور جنگی قیدیوں کی واپسی شروع کرانے میں کامیاب ہوگئی اور یہ غالبًا سب سے بڑا کارنامہ ہے جو وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی سوجھ بوجھ کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وزیراعظم نے اندرونِ ملک اصلاحات کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ عوام سے کیے گئے وعدوں کے مطابق کئی بڑی صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ دُور رس زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ تعلیمی ادارے قومیائے گئے اور انتظامی اور صنعتی اصلاحات لائی گئیں۔ پبلک سیکٹر میں پوری انتظامی مشینری کو اوورہال کر دیا گیا۔ بدعنوان اور نااہل افسروں کو نکال باہر کیا گیا۔ قانون سازی کی رفتار بڑھائی گئی اور اس میں جو قانونی سقم تھے انہیں دُور کر دیا گیا اس کے بعد عوامی حکومت نے قوم کو عوامی آئین دینے کا کام شروع کیا۔ ملک کو ۲۶ برس میں ایک مستقل آئین نہ مل سکا تھا پیپلز پارٹی نے آئین کے معاملے میں ایسی وسیع النظری رواداری اور ترقی پسندی کا مظاہرہ کیا کہ اس سے پہلے کسی حکمران سیاسی پارٹی نے کیا ہوگا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے جو قدم اٹھائے تھے۔ ان میں نیشنل عوامی پارٹی کے ان لیڈروں کی رہائی شامل تھی جنہیں یحییٰ خان نے قید کر رکھا تھا۔ جناب بھٹو نے حزب اختلاف سے مسلسل مذاکرات جاری رکھے اور ایک معاہدہ ہوگیا، لیکن حزب اختلاف نے جلد ہی اس معاہدے کو توڑ ڈالا۔ بہر حال پیپلز پارٹی نے سیاسی افہام و تفہیم کے لیے جس جذبے کا مظاہرہ کیا ہے وہ پاکستان میں پارٹی کی حکومتوں کی تاریخ میں بے مثال ہے صوبائی خودمختاری اب ماضی کا قصہ ہے کیونکہ دستور میں چاروں صوبوں کے مفادات کو تحفظ دیا گیا ہے اور قومی سالمیت و یکجہتی کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ دستور تمام منتخب نمائندوں کی بھرپور منظوری کے بعد بنا ہے۔ ۱۴ ؍اگست ۱۹۷۳ء سے ہم کم و بیش برطانوی طرز کے پارلیمانی جمہوری نظام پر چل رہے ہیں جس میں حکومت کا سربراہ وزیراعظم ہوا کرتا ہے پی پی پی نے جمہوریت کا جو پودا لگایا ہے اس کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور آثار بتاتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت خوب پھولے پھلے گی۔

جس وقت پاکستان پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا۔ بیرونی دنیا میں پاکستان کا وقار ختم ہو چکا تھا — جناب ذوالفقار علی بھٹو نے متعدد غیر ملکی دورے کرکے اور امور خارجہ کو اپنی ذاتی نگرانی میں چلا کے ملک کے وقار کو بحال کر دیا ہے فوجی معاہدوں سے پاکستان کا تعلق برائے نام رہ گیا ہے اور ہم دولت مشترکہ سے نکل آئے ہیں اس طرح قومی اصولوں کے مطابق آزادانہ خارجہ پالیسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی ہے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے کارناموں کا محض ایک طائرانہ جائزہ ہے۔ اب ملک ترقی کے راستے پر قدم جما کے چل رہا ہے اور وہ سیاسی پنڈت جنہوں نے خطرے کی گھنٹیاں بجانے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی، منہ چھپائے پھر رہے ہیں جب پارٹی نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیا تو انہوں نے نعرہ دیا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ لیکن جب عوام نے دیکھ لیا کہ اسلام کو کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے تو ان عوام دشمنوں نے ایک نیا ہوّا کھڑا کر دیا۔ یہ کہ پاکستان خطرے میں ہے، ملک خطرے میں ہے کا نعرہ، اُنہوں نے اسی وقت سے لگانا شروع کر دیا تھا جب پارٹی کو اقتدار ملا تھا لیکن انہیں ایک مرتبہ پھر منہ کی کھانی پڑی اور ہر شخص کو اب احساس ہو گیا ہے کہ ملک نہ صرف خطرات سے باہر نکل آیا ہے بلکہ اس کے قدم بھی جم گئے ہیں اور اب ان لوگوں کے پاس کسی نئے خطرے کا نعرہ نہیں رہا ہے۔ اور بقول شخصے ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

پیپلز پارٹی کے قنوطی ناقدوں کی رائے کے برعکس "پارٹی کی حکومت بدستور اس راستے پر چل رہی ہے جہاں سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی ایک نظام قائم ہے اور قومی یکجہتی اور سالمیت حکومت کا دلی مقصد ہے اس مضمون کو پارٹی کے ناقدوں سے غالب کی زبان میں یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ :

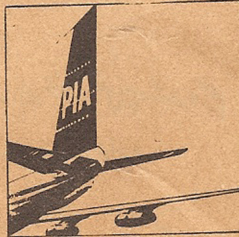
یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

پی آئی اے
نیویارک کی
جانب



محو پرواز ہے...

اس کے علاوہ پیکنگ ★ لندن
پیرس ★ ایمسٹرڈم ★ فرینکفرٹ
جینوا ★ روم ★ ویانا
استنبول ★ ایتھنز ★ بیروت
دمشق ★ قاہرہ ★ بغداد
کویت ★ دھران ★ جدہ



عدن ★ نیروبی ★ دارالسلام
تہران ★ بحرین ★ دوحا
ابوظبی ★ دوبئی ★ مسقط ★ کابل
شنگھائی ★ بنکاک ★ کولمبو
ٹوکیو ★ منیلا ★ کوالالمپور
سنگاپور اور جکارتہ بھی ہماری منزلیں ہیں

PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز

IAL - IPP - 18 - 72



پاکستانیوں سے بہتر امیدیں ۔
اور جامعہ سے بہترین توقعات ۔

جامعہ

پٹرولیم کی صنعت میں
اوّلین پاکستانی ادارہ



جملہ صنعتی ضروریات کے لئے خصوصی پٹرولیم
لُبریکینٹس بنانے والا سب سے بڑا ادارہ ۔



افواجِ پاکستان کو لُبریکینٹس اور گریس کے
سب سے بڑے سپلائر ۔



ڈائریکٹوریٹ آف انوسٹمنٹ پروموشن اور
سپلائز کی پٹرولیم لُبریکینٹس اور گریس کی جملہ
ضروریات کے سب سے بڑے سپلائر ۔